آسان علم کلام

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی





المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد انڈیا



آسان علم کلام

دینی مدارس کے لئے نصابی نقطۂ نظر سے لکھی گئی ایک مختصر، آسان اور جامع کتاب، جس میں علم کلام کا تعارف بھی ہے، تاریخ بھی ہے، فِرَقِ ضالہ کا بھی تذکرہ ہے اور اہل سنت والجماعت کے اعتقادی مسالک کا بھی، نیز اہل سنت والجماعت کے عقائد کو بھی نقلی وعقلی دلائل سے واضح کیا گیا ہے۔

حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

ناشر

المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد

طبع اول ۱۴۴۱ھ،۲۰۲۰ء

کتاب	:	آسان علم کلام
تالیف	:	حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی
صفحات	:	۲۲۴
کمپیوٹر کتابت	:	مولانا محمد نصیر عالم سبیلی (فون نمبر:9959897621)
سرِورق	:	العالم اُردو کمپیوٹرس حیدرآباد،فون نمبر:8919409102
سن طباعت	:	ذوالقعدہ ۱۴۴۱ھ، جولائی ۲۰۲۰ء

ناشر

المعہد العالی الاسلامی، حیدرآباد

کلمۂ سپاس

اِس کتاب کا یہ پہلا اڈیشن ایک عزیز مخلص دوست ـــــ جو جامعہ فلاحِ دارین ترکیسر کے فاضل اور لندن میں مقیم ہیں اور اپنا نام ظاہر کرنا نہیں چاہتے ـــــ کی طرف سے طبع کیا جارہا ہے، فجزاہ اللہ خیر الجزاء۔

فہرست مضامین

پیش لفظ : حضرت مولانا مفتی احمد خانپوری صاحب دامت برکاتہم ۱۰

ابتدائیہ : مؤلف ۱۳

پہلا باب : علم کلام — تعارف اور اہمیت

لغوی اور اصطلاحی معنی ۲۱

علم کلام کے مختلف نام ۲۳

علم کلام کا موضوع ۲۵

متکلمین کے کام ۲۶

علم کلام کے مادحین ۲۷

علم کلام کے ناقدین ۲۹

● تمرینی سوالات ۳۴

دوسرا باب : علم کلام — آغاز وارتقاء

پہلا مرحلہ ۳۷

گناہِ کبیرہ کا مرتکب ۳۸

جبر واختیار ۳۹

امامت ۴۱

دوسرا مرحلہ ۴۳

۱- حَشویہ ۴۴

۲- ظاہریہ ۴۴
۳- حنابلہ ۴۵
۴- اَشاعرہ ۴۵
۵- ماتریدیہ ۴۶
● تمرینی سوالات ۴۶

تیسرا باب : چند فِرَقِ ضالہ

۱- اسماعیلیہ ۴۹
۲- اثنا عشریہ ۵۳
● تمرینی سوالات ۵۷
۳- معتزلہ ۵۸
پانچ بنیادی عقائد ۵۹
توحید ۶۰
عدل ۶۱
وعدہ و وعید ۶۲
منزلہ بین المنزلتین ۶۳
امر بالمعروف و نہی عن المنکر ۶۳
۴- زیدیہ ۶۳
۵- خوارج ۶۵
● تمرینی سوالات ۶۷

چوتھا باب : علم کلام — چھٹی صدی ہجری سے دورِ حاضر تک

تیسرا مرحلہ ۷۱

چوتھا مرحلہ ۷۳
پانچواں مرحلہ ۷۴
● تمرینی سوالات ۷۹

پانچواں باب : اہلِ سنت کے اعتقادی مسالک

اہل السنۃ والجماعۃ ۸۳
اَشاعرہ ۸۵
مذہبِ اشعری — تدوین وارتقاء ۸۹
ماتریدیہ ۸۹
اشاعرہ اور ماتریدیہ کے درمیان اختلافی مسائل ۹۰
ماتریدیہ اور معتزلہ کے درمیان اختلاف ۹۳
جن مسائل میں ماتریدیہ اور معتزلہ کا اتفاق ہے ۹۴
ماتریدیہ اور اہلِ سنت کے دوسرے مسالک ۹۵
حنابلہ ۹۶
اشاعرہ وماتریدیہ اور حنابلہ کے درمیان اختلاف ۹۸
● تمرینی سوالات ۱۰۰

چھٹا باب : اہلِ سنت والجماعت کے عقائد

ایمان کی حقیقت ۱۰۵
تصدیق ۱۰۵
اقرار باللسان ۱۰۶
معرفت ۱۰۷
اعمالِ صالحہ ۱۰۸

ایمان اور اسلام	۱۰۹
کفر	۱۱۰
ارکان ایمان	۱۱۰
● تمرینی سوالات	۱۱۱
اللہ تعالیٰ پر ایمان	۱۱۲
وجود باری	۱۱۲
دلیلیں	۱۱۲
توحید	۱۱۶
توحید فی الالوہیت	۱۱۶
عبادت کی مختلف شکلیں	۱۱۷
توحید ربوبیت	۱۲۰
صفاتِ باری	۱۲۱
متشابہات (تفویض وتاویل)	۱۲۱
انسانی زندگی پر عقیدۂ توحید کا اثر	۱۲۳
● تمرینی سوالات	۱۲۴
انبیاء پر ایمان	۱۲۶
نبوت کی ضرورت	۱۲۶
نبی اور رسول	۱۲۸
تمام انبیاء پر ایمان	۱۲۹
انبیاء کی بعض خصوصیات	۱۳۳
۱- عصمت	۱۳۳
۲- دعوتِ توحید	۱۳۴

۳- اطاعت وفرمانبرداری	۱۳۵
۴- بشریت	۱۳۵
۵- عبدیت	۱۳۷
۶- منصب نبوت وہبی ہے نہ کہ کسبی	۱۳۸
معجزہ	۱۴۰
کرامات	۱۴۳
استدراج	۱۴۴
● تمرینی سوالات	۱۴۴
نبوتِ محمدی	۱۴۵
دلیلِ نبوت	۱۴۵
نبوتِ محمدی کی خصوصیات	۱۴۷
۱- ختم نبوت	۱۴۷
۲- بعثت عامہ	۱۴۹
۳- افضل المخلوقات	۱۵۰
۴- مقامِ محمود	۱۵۱
بعض مبالغہ آمیز خیالات	۱۵۳
علمِ غیب	۱۵۳
حاضر وناظر	۱۵۴
مختارِ کُل ہونا	۱۵۵
● تمرینی سوالات	۱۵۷
منصب نبوت	۱۵۸
حُب رسول	۱۶۰

حجیت حدیث	۱۶۱
صحابہؓ	۱۶۴
اہلِ بیتؓ	۱۷۰
دو غالی گروہ	۱۷۷
مشاجرات صحابہؓ	۱۸۰
● تمرینی سوالات	۱۸۰
آسمانی کتابوں پر ایمان	۱۸۲
قرآن مجید کی بعض خصوصیات	۱۸۵
● تمرینی سوالات	۱۸۸
ملائکہ پر ایمان	۱۸۹
جِنات اور شیاطین	۱۹۳
● تمرینی سوالات	۱۹۶
آخرت پر ایمان	۱۹۷
آخرت کا تصور، عقل کی روشنی میں	۱۹۷
دنیوی زندگی میں عقیدۂ آخرت کا اثر	۱۹۹
نظریۂ تناسخ	۲۰۰
آخرت پر ایمان سے مراد	۲۰۳
برزخی زندگی	۲۰۳
قبر میں سوال وجواب	۲۰۳
قیامت کی علامتیں	۲۰۶
ظہورِ مَہدی	۲۰۸
دجال کا خروج	۲۰۹

نزولِ عیسیٰ علیہ السلام	۲۱۰
قیامت	۲۱۲
بعثت ثانیہ	۲۱۳
نامۂ اعمال	۲۱۴
وزنِ اعمال	۲۱۴
پُل صراط	۲۱۶
حوضِ کوثر	۲۱۶
جنت	۲۱۶
جہنم (دوزخ)	۲۱۸
اَعراف	۲۲۰
● تمرینی سوالات	۲۲۰
تقدیر پر ایمان	۲۲۱
دنیا میں عقیدۂ تقدیر کا فائدہ	۲۲۴
● تمرینی سوالات	۲۲۴



قابلِ توجہ

یہ کتاب دینی مدارس کی نصابی ضرورت کے تحت مرتب کی گئی ہے؛ اس لئے شرح عقائد سے پہلے کسی جماعت میں اس کو شامل کرنا انشاء اللہ مفید ہوگا، اگر پوری کتاب داخلِ نصاب کرنے میں دشواری ہو تو چھٹا باب (اہل سنت والجماعت کے عقائد) شامل کرنے کی کوشش کی جائے۔

پیش لفظ

حضرت مولانا مفتی احمد خانپوری صاحب دامت برکاتہم
(شیخ الحدیث: جامعہ تعلیم الدین ڈابھیل، گجرات)

الحمد للّٰہ و کفٰی وسلام علٰی عبادہ الذین اصطفٰی .

بلا شبہ دین اسلام کا ہر مسئلہ غیر معمولی ہے؛ مگر عقائد کی عظمت واہمیت سے کون انکار کرسکتا ہے! عقائد میں فساد و بگاڑ اور ایمانیات میں خرابی درحقیقت دنیا وآخرت کی بربادی ہے، اسلامی عقائد اور علم الکلام کے موضوع پر اب تک سینکڑوں کتابیں لکھی جا چکی ہیں، اُن میں سے کچھ تو قدیم یونانی فلسفہ یا جدید مغربی فکر سے متاثر ہیں اور بعض متکلمانہ ومناظرانہ اُسلوبِ بیان کی حامل، جن سے دماغ (عقل) کی آسودگی کا اگر تھوڑا بہت سامان ہو بھی جائے تب بھی دل (قلب) مطمئن نہیں ہوتا، عصرِ حاضر میں کائنات اور انسان سے متعلق نو دریافت شدہ حقائق کو سامنے رکھ کر اسلامی عقائد کے اثبات کا ایک نیا رجحان پیدا ہوا ہے، یہ کوشش اگرچہ مستحسن ہے؛ مگر افسوس کہ اکثر مؤلفین اِس سلسلے میں افراط وتفریط کا شکار ہو گئے ہیں، سائنس چوں کہ غیبیات سے بحث نہیں کرتی اور عقائد کا دار و مدار ہی ایمان بالغیب پر ہے؛ اس لئے ایسے حقائق جو انسانی مشاہدات سے ماورا ہیں، اُن کے بارے میں سائنس ہمیں کیا رہنمائی کرسکتی ہے! ظاہر ہے زیادہ سے زیادہ چند ثابت شدہ حقائق سے بعض مخفی اُمور پر استدلال کیا جاسکتا ہے اور شریعت کے بعض احکام کے اندر پوشیدہ حکمتیں سمجھی جاسکتی ہیں۔

ان رجحانات کے مقابلے میں ہمیں قرآن مجید کے اندر عقائد کے اثبات کا انداز زیادہ اپیل کرتا ہے، جہاں نہ فلسفیانہ موشگافیاں ہیں نہ متکلمانہ قیل وقال، نہ ریاضیاتی فارمولے

نہ نظام شمسی کی تشریح، نہ اعضائے جسمانی کی سرجری؛ مگر بہ ایں ہمہ حقائق کا سیدھا سادا اظہار ہے جو عقل اور قلب دونوں کو مطمئن کرتا ہے، سلفِ صالحین (صحابہ، تابعین، تبع تابعین اور ائمہ عظام) نے اسلام کے دیگر شعبوں کی طرح عقائد کے باب میں بھی قرآن مجید پر اعتماد کیا اور اس کی مزید تشریح و توضیح کے لئے صرف صحیح احادیث کا سہارا لیا، عقائد کے باب میں خصوصاً انھوں نے اپنی رائے کا استعمال کرنے کے بجائے کتاب وسنت کے اندر مذکور حقائق کے بیان کر دینے پر اکتفا کیا ہے، محدثین کی مستقل تصانیف کے علاوہ کتب حدیث کے اندر عقائد سے متعلق ابواب پر ایک نظر ڈالنے سے اس حقیقت کا بخوبی اظہار ہوسکتا ہے، اللہ جزائے خیر دے حضرت مولانا مفتی خالد سیف اللہ رحمانی زید مجدہم کو، کہ انھوں نے زیر نظر ''آسان علم کلام'' نامی کتاب مرتب فرما کر اُمتِ مسلمہ پر بڑا احسان فرمایا، یہ کتاب اِس موضوع پر جامع اور دلائل سے مبرہن ہے۔

کسی علمی کتاب میں تین باتیں بہ طورِ خاص دیکھنے کی ہوتی ہیں، ایک: اس کا مواد اور ماٰخذ، دوسرے: اس مواد سے نتائج کا استخراج اور موضوع کا تحلیل و تجزیہ، تیسرے: ترتیب اور اُسلوبِ بیان، جہاں تک مواد اور ماٰخذ کا تعلق ہے تو فاضل مؤلف کی یہ کاوش قابل تعریف و تحسین ہے کہ انھوں نے کافی محنت کے ساتھ موضوع کا اُس کے مستند ماٰخذ سے مطالعہ کیا ہے، اور اس کتاب میں کارآمد مواد جمع کر دیا ہے، رہا اس مواد سے نتائج کا استخراج، موضوع کا تحلیل وتجزیہ اور ترتیب واُسلوبِ بیان، سو اِس لحاظ سے بھی یہ ایک کامیاب اور قابلِ ستائش کوشش ہے، اس سے پہلے بھی فاضل مؤلف دینی مدارس کے لئے نصابی نقطۂ نظر سے متعدد کتابیں مرتب فرما کر نتیجہ خیز مساعیٔ جمیلہ فرما چکے ہیں، بلا مبالغہ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ: سہل نویسی و شیریں زبان میں موجودہ علماء کے درمیان موصوف ممتاز مقام کے حامل ہیں، وہ لاجواب زبان لکھتے اور بولتے ہیں، شیرینی، پختگی اور قرآن وحدیث کے ذخیرے سے تُرشی ہوئی ان کی زبان اپنی الگ شناخت رکھتی ہے، وہ جب بولتے ہیں تو موتیاں رولتے ہیں اور جب لکھتے ہیں تو قلم سے فصاحت و بلاغت اُبلتی ہے، اور جو کچھ لکھتے ہیں اُس کی سطر سطر سے

نورانیت اور روحانیت چھلکتی ہے، اُن کو پڑھنے اور سننے والا کبھی اُکتا تا ہے اور نہ سیر ہوتا ہے؛ بلکہ شوق وذوق سے سنتا اور پڑھتا چلا جاتا ہے۔

موصوف کی سہل نویسی کی شہادت تو حضرت مولانا قاری محمد صدیق صاحب باندوی نوراللہ مرقدہ نے دی ہے :

ماشاء اللہ آپ کے اندر سہل نویسی کی صلاحیت بھی ہے اور محنت کا جذبہ بھی؛ اس لئے میری خواہش ہے کہ آپ اس کام کو کر گزریئے؛ البتہ مَیں دُعا کروں گا کہ اللہ تعالیٰ اس کام کو آپ کے لئے آسان کردیں۔ (دیکھئے: ابتدائیہ کتاب ہذا)

اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کی دلی مُرادیں پوری فرماہی دیتے ہیں :

می دہد ایزد مراد متقیں بے قیاس وبے گمان وبے یقیں

شاید حضرت باندویؒ کی اسی دُعاء کا اثر آج ہم ''آسان علم کلام'' کی شکل میں دیکھ رہے ہیں۔

احقر نے کتاب کو سرسری نظر سے دیکھا تو عمدہ اور جامع پایا، دل سے دُعاء کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اِس کتاب کو بے حد قبولیت بخشے اور فاضل مؤلف کو اسی طرح کی دینی علمی اور سماجی خدمات کے لئے موفّق فرمائے، اُمید ہے کہ علمی حلقے اِس نادر علمی تحفے کو ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔

۲۲ / ذیقعدہ ۱۴۴۱ھ ۔۔۔ اُملاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

۱۴ / جولائی ۲۰۲۰ء ۔۔۔ (گجرات)



ابتدائیہ

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس نے بھی ''لا الٰہ الا اللہ'' کہا ہو، وہ جنت میں داخل ہوگا، عرض کیا گیا: اگر چہ کہ وہ زنا اور چوری کا مرتکب ہو، آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں، اگر چہ وہ ان گناہوں کا مرتکب ہوا ہو: ''من قال : لا إلٰه الا الله فقد دخل الجنة...، و إن زنیٰ و إن سرق''۔ (بخاری عن ابی ذرؓ، کتاب اللباس، حدیث نمبر: ۵۸۷۲)

نیز اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ ہر گناہ کو معاف فرمادیں گے؛ لیکن اس کے ساتھ شرک کرنے کو معاف نہیں فرمائیں گے :

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِيْدًا ۔ (نساء:۱۱۶)

یہ آیت اور حدیث واضح کرتی ہے کہ اسلام میں عقیدہ کی کیا اہمیت ہے؟ انسان کتنا بھی گنہگار رہو، اللہ اپنے فضل و کرم سے اس کو معاف کر سکتے ہیں، اگر وہ صاحبِ ایمان ہو، اور اگر آخرت میں اس کو گناہوں کی سزا دی گئی، تب بھی سزا پانے کے بعد انجامِ کار انشاء اللہ وہ جنت میں داخل کیا جائے گا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم جاری ہوگا کہ جس کے دل میں ایمان کا ایک ذرہ بھی ہو، اس کو دوزخ سے نکال کر جنت میں داخل کر دیا جائے؛ لیکن ایمان سے محروم ہونے کے بعد کوئی شخص انسانی بنیادوں پر اچھا کام کرے تو یہ تو ہوسکتا ہے کہ دنیا میں اللہ کی طرف سے اس کو نیکی کا صلہ مل جائے، مگر آخرت میں اس کی نجات نہ ہوگی۔

اس سے عقیدہ کی اہمیت معلوم ہوتی ہے، اسی لئے قرآن مجید کا غالب ترین حصہ درست عقائد کی دعوت، نادرست عقائد کی اصلاح اور توحید و رسالت اور آخرت کے دلائل پر مشتمل ہے، گذشتہ انبیاء کرام اور ان کی اقوام کے جو قصص و واقعات قرآن میں آئے ہیں، ان

کی بھی روح یہی ہے، ان میں بھی ان کی بداعتقادیوں پر نقد کیا گیا ہے اور انبیاء کی دعوتِ توحید کو مدلل طور پر پیش کیا گیا ہے۔

قرآن وحدیث کے احکام کا ایک حصہ وہ ہے جو عقائد سے متعلق ہے، یہ پہلے نبی حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر رسول اللہ ﷺ تک ایک ہی ہیں، اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی، اسی کو قرآن مجید نے دین سے تعبیر کیا ہے :

شَرَعَ لَکُمۡ مِّنَ الدِّیۡنِ مَا وَصّٰی بِہٖ نُوۡحًا وَّ الَّذِیۡۤ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡکَ وَمَا وَصَّیۡنَا بِہٖۤ اِبۡرٰہِیۡمَ وَمُوۡسٰی وَعِیۡسٰۤی ۔ (شوریٰ:۱۳)

البتہ جو عملی احکام ہیں، ان میں ہر اُمت کی ضرورت کے لحاظ سے من جانب اللہ تبدیلی ہوتی رہی ہے، اس کو قرآن مجید میں شریعت سے تعبیر کیا گیا :

لِکُلٍّ جَعَلۡنَا مِنۡکُمۡ شِرۡعَۃً وَّ مِنۡہَاجًا ۔ (المائدۃ:۴۸)

مگر رسول اللہ ﷺ پر چوں کہ نبوت کا سلسلہ تمام ہو چکا؛ اس لئے اب شریعت میں بھی کوئی تبدیلی نہیں ہوگی ؛ البتہ انسانی زندگی میں پیش آنے والے بعض مسائل کے بارے میں سکوت یا ابہام اختیار کیا گیا ہے، ایسے مسائل کے حل کے لئے رسول اللہ ﷺ نے اجتہاد کا حکم دیا ہے، پس زمانہ کے احوال کے لحاظ سے فقہاء کے اجتہاد میں تبدیلی ہوسکتی ہے؛ لیکن اللہ کی بھیجی ہوئی شریعت میں تبدیلی نہیں ہوسکتی۔

معلوم ہوا کہ 'دین' جو بنیادی طور پر عقائد حقہ سے عبارت ہے، اس کی اہمیت سب سے زیادہ ہے، صحابہ کے دور میں قرآن وحدیث کی سادہ تعلیمات اسلامی عقائد کی ترجمانی کے لئے کافی ہو جاتی تھیں، اُمت کے اندر فرق باطلہ پیدا نہیں ہوئے تھے؛ لیکن جب فارس کا علاقہ فتح ہوا تو فرق باطلہ بھی پیدا ہوئے اور عجمی فلسفہ بھی مسلم دنیا میں پہنچا، اب فقہ کی طرح ایک ایسے علم کی ضرورت پڑی جو اسلامی عقائد کو کتاب وسنت کی روشنی میں تو پیش کرے ہی، ساتھ ہی ساتھ اس پر عقلی دلائل بھی فراہم کرے اور افکار باطلہ کا مدلل رد بھی ہو، اس کام کا بیڑا متکلمین نے اُٹھایا اور علم کلام کو اسلامی علوم کی ایک مستقل شاخ کی حیثیت سے پروان چڑھایا۔

چنانچہ علم کلام کی اہمیت کی وجہ سے دینی درسگاہوں میں اہمیت کے ساتھ اس مضمون کو پڑھایا جاتا رہا ہے، برصغیر کے مدارس میں بھی یہ داخل نصاب ہے، اصل نصاب میں علامہ ابوحفص نسفیؒ کی عقائد پر علامہ سعدالدین تفتازانیؒ کی شرح ''شرح عقائد نسفی'' پڑھائی جاتی ہے، بعض بڑی درسگاہوں میں تکمیل کے شعبہ میں عقیدۃ الطحاوی اور مسامرہ کی تعلیم دی جاتی ہے؛ لیکن ان شعبوں میں دورۂ حدیث سے فارغ ہونے والے طلبہ میں سے دوتین فیصد بھی بہ مشکل داخلہ لیتے ہیں، زیادہ تر صرف شرح عقائد پڑھتے ہیں، پھر شرح عقائد کی تالیف اس دور میں ہوئی جب عالم اسلام پر منطق و فلسفہ کا غلبہ تھا اور دینی درسگاہوں میں بھی تقریباً دو تہائی معقولات کی کتابیں شامل نصاب ہوتی تھیں؛ اس لئے اس کا اُسلوب معقولی و منطقی ہے؛ اس لئے جس آسانی سے طلبہ تفسیر و حدیث اور فقہ کے مضامین پڑھ لیتے ہیں، عقائد نہیں پڑھ پاتے ہیں۔

اسلامی علوم کی تدریس میں تدریج اور سہولت کے لئے ہمارے بزرگوں نے یہ تدبیر اختیار کی کہ فن کی پہلی کتاب مادری زبان میں پڑھادی جائے، پہلے یہ کتابیں فارسی میں تھیں؛ کیوں کہ مغلوں کے دور میں یہی سرکاری زبان تھی، برطانوی دور میں بھی بہت سے دفتری کاغذات فارسی میں لکھے جاتے تھے، آزادی کے بعد بھی کچھ عرصہ کمی کے ساتھ سہی، فارسی کو ایک اہمیت حاصل رہی، مگر رفتہ رفتہ اس کی جگہ اُردو نے لے لی؛ چنانچہ اب تقریباً ہر فن میں فن کی ابتدائی کتاب اُردو زبان میں پڑھائی جاتی ہے؛ لیکن علم کلام میں ایسا نہیں ہوسکا، نتیجہ یہ ہے کہ طلبہ علم کلام کی ابتدائی معلومات سے بھی محروم رہتے ہیں اور سیدھے شرح عقائد پڑھتے ہیں؛ اس لئے سمجھنے میں بھی دشواری ہوتی ہے، بعض مضامین تو اس طرح پڑھتے ہیں کہ ان کو یہ بھی پتہ نہیں چل پاتا کہ اس کا ایمانیات سے کیا تعلق ہے؟ لطیفہ یہ ہے کہ زمانۂ طالب علمی میں میری شرح عقائد کی تکرار کو میرے رفقاء درس بہت پسند کرتے تھے؛ لیکن پڑھاتے وقت اندازہ ہوا کہ میری یہ تکرار طوطے کی رَٹ سے زیادہ نہیں تھی، خوبی صرف یہی تھی کہ میں استاذ کی پوری بات ان ہی کے انداز پر نقل کردیتا تھا اور اسی پر ڈھیر ساری داد مل جاتی تھی۔

اس لئے جب زمانۂ تدریس میں شرح عقائد کا درس مجھ سے متعلق ہوا تو شدت سے

احساس ہوا کہ اس کتاب سے پہلے مادری زبان اور آسان لب و لہجہ میں عقائد کی کتاب پڑھائی جانی چاہئے، جو تدریسی منہج پر لکھی گئی ہو، مگر یہ ایک احساس ہی رہ گیا، عرصہ بعد ایک بار عالم ربانی صدیق وقت حضرت مولانا قاری محمد صدیق باندویؒ حیدرآباد تشریف لائے، حیدرآباد میں مجلس علمیہ آندھرا پردیش علماء دیوبند کی ایک نمایاں تنظیم ہے، اسی کے دفتر میں اہل علم کے ساتھ قاری صاحبؒ کی ملاقات رکھی گئی، اس موقع پر میں نے عرض کیا کہ نحو وصرف وغیرہ میں آپ نے تسہیلات کا جو سلسلہ قائم فرمایا ہے، وہ بہت بہتر ہے؛ لیکن ایک ضرورت ''تسہیل الکلام'' کی بھی ہے؛ کیوں کہ اس فن میں پر طلبہ کی استعداد کے لحاظ سے کوئی کتاب نہیں ملتی، قاری صاحبؒ نے فرمایا: آپ کا احساس درست ہے اور اس کی ضرورت ہے، مگر میری اب عمر بھی زیادہ ہو چکی ہے، اسفار بھی بہت کرنے پڑتے ہیں اور نصاب بھی بہ مشکل پورا کرتا ہوں، ماشاء اللہ آپ کے اندر سہل نویسی کی صلاحیت بھی ہے، اور محنت کا جذبہ بھی ہے؛ اس لئے میری خواہش ہے کہ آپ اس کام کو کر گذریئے؛ البتہ میں دُعا کروں گا کہ اللہ اس کام کو آپ کے لئے آسان کر دیں۔

یہ بات آئی گئی ہوگئی، عرصہ بعد ایک بار دیوبند حاضری ہوئی تو عصر بعد حضرت مولانا مفتی سعید احمد پالن پوریؒ سے ملاقات کے لئے حاضری ہوئی، وہ ماشاء اللہ ہمیشہ کسی نہ کسی تصنیفی کام میں مشغول رہتے تھے، اس وقت غالباً ''تحفۃ القاری'' سے فارغ ہوئے تھے، مجلس میں اس کا بھی ذکر آیا، میں نے عرض کیا: اگر اب آپ علم کلام پر کوئی نصابی کتاب مرتب کر دیں، جس کو طلبہ شرح عقائد سے پہلے پڑھ لیں تو بہت بہتر ہو، اور میں یہ آپ سے اس لئے عرض کر رہا ہوں کہ آپ کی تحریر میں درسی ضرورت کا بھرپور لحاظ ہوتا ہے، فرمانے لگے: یہ بات تو صحیح ہے اور اس کی ضرورت ہے، مگر ابھی میں ''ہدایت القرآن'' کے ابتدائی پاروں کے کام کی طرف متوجہ ہوں، یہ کام مکمل ہونے کے بعد ہی کوئی اور کام کر سکوں گا، بہر حال اس میں کوئی پیش رفت نہیں ہو سکی۔

مارچ ۲۰۲۰ء میں میرا ایک سفر ازبکستان کا ہوا، جس کا مقصد ماضی کے علمی مراکز کی

زیارت تھا، اور یہ سفر شعبان سے کچھ پہلے ہوا تھا، دل میں ارادہ پیدا ہوا کہ سفر سے واپسی پر اللہ کے بھروسہ اس کام کو شروع کیا جائے، کچھ مواد اِکٹھا کیا، کچھ کرایا، اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ میری واپسی تک ہندوستان میں کورونا کی وبائی بیماری پھیلنے لگی، میں ۲۱/ مارچ ۲۰۲۰ء کو واپس ہوا، پھر ۱۸/ دنوں دلی ہی میں قرنطینہ میں رہنا پڑا، اس کے بعد پورے ملک میں لاک ڈاؤن نافذ ہوگیا اور ۳/ رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ، ۲۷/ اپریل ۲۰۲۰ء کو بہ دشواریِ تمام حیدرآباد واپسی ہوئی، قرنطینہ سے نکلنے کے بعد یہ ۱۹/ دن اسلامک فقہ اکیڈمی دہلی کے دفتر میں گذرے، اس کام کے لئے میں نے اس وقت کو غنیمت جانا، اکیڈمی میں لائبریری بھی تھی، مجھے خود لکھنے میں دشواری ہوتی ہے، اور ایک عرصہ سے املاء کرنے کی عادت پڑ گئی ہے، یہاں رفیق عزیز مولانا امتیاز احمد قاسمی سلمہ موجود تھے، انھوں نے تعاون کیا۔

پھر نیٹ کے ذریعہ کچھ اُردو کتابیں بھی مل گئیں، ان سے بھی بہت نفع ہوا، ان کتابوں میں سب سے اہم حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ کی ''اسلامی عقائد'' ہے، ہمارے بزرگوں میں مولانا کاندھلویؒ کو علم کلام سے خاص مناسبت تھی، ان کی تفسیر ''معارف القرآن'' اور ان کی سیرت نبوی ''سیرۃ المصطفیٰ'' میں بڑی اہم کلامی بحثیں آگئی ہیں، یہ کتاب بھی نہایت اہمیت کی حامل ہے؛ لیکن طلبہ کی استعداد کی موجودہ سطح کے اعتبار سے کسی قدر مشکل ہے اور نصابی نقطۂ نظر سے نہیں لکھی گئی ہے، اُردو میں ایک دو اور کتابیں بھی ملیں، جو اپنے موضوع پر معلومات کی جامع اور لائق تحسین ہیں، مگر اس میں کلامی مباحث کے ساتھ ساتھ دعوتی و تذکیری مضامین بھی کافی آگئے ہیں، نصاب کے لئے جس طرح کا متن مطلوب ہوتا ہے، اس کی کمی ہے۔

اس لئے راقم الحروف نے اس کام کو شروع کیا، بیشتر کام وہیں ہوگیا تھا، کچھ کام باقی تھا، گھر پہنچنے کے بعد چند دنوں میں یہ بھی مکمل ہوگیا، اصل کتاب اِس کتاب کا چھٹا باب ہے، جو اہل سنت والجماعت کے عقائد پر مشتمل ہے، چند سال پہلے ملک کی ایک یونیورسٹی کے تقاضے پر اسلامک اسٹڈیز کے نصاب کے لئے میں نے علم کلام سے متعلق چند اکائیاں لکھی تھیں، جو زیادہ تر علم کلام کی تعریف اور تاریخ، نیز ضمنی طور پر مختلف اعتقادی مکاتبِ فکر کے بنیادی

نظریات سے متعلق تھیں، ان کو بھی کسی قدر ترمیم کے ساتھ اس میں شامل کر دیا، کتاب کے ابتدائی تین ابواب یہی مضامین ہیں۔

کوشش کی گئی ہے کہ اہل سنت والجماعت کے بنیادی عقائد کو آسان زبان میں مرتب کیا جائے، حسبِ ضرورت متکلمین کی کتابوں کے حوالے نقل کئے جائیں، کتاب وسنت سے ان کی دلیلیں ذکر کی جائیں اور جہاں عقلی دلائل کی ضرورت ہو، وہاں عقلی دلائل کا بھی اختصار سے ذکر کیا جائے، نیز باطل افکار کا حسبِ ضرورت قرآن وحدیث یا عقلی دلائل سے رد کیا جائے اور ہر باب کے آخر میں تمرینی سوالات بھی لکھے جائیں؛ چوں کہ کام نصابی نقطۂ نظر سے کیا گیا؛ اس لئے آیات واحادیث اور عربی عبارتوں کا ترجمہ قصداً چھوڑ دیا گیا ہے؛ تاکہ طلبہ کے لئے محنت کی کوئی چیز باقی رہے۔

اس کام میں حوالہ جات کی تخریج میں عزیزان مکرمان مولانا عبید اختر رحمانی، مولانا محمد ندوی اور مولانا محمد عزیر فلاحی — سلمہم اللہ تعالیٰ وبارک فی علومہم واعمالہم — کا تعاون بھی بہت قابل تشکر ہے، فجزاھم اللہ خیر الجزاء۔

یہ حقیر بزرگ عالم دین، داعی و مصلح، ممتاز فقیہ، استاذ الاساتذہ حضرت مولانا مفتی احمد خانپوری زیدلطفہ (شیخ الحدیث: جامعہ تعلیم الدین ڈابھیل، گجرات) کا بھی شکر گذار ہے کہ انھوں نے اس حقیر کوشش کی اپنے پیش لفظ کے ذریعہ حوصلہ افزائی فرمائی، متع اللہ المسلمین بطول حیاتہ۔

خدا کرے یہ حقیر سی کوشش عنداللہ وعندالناس مقبول ہو اور طالبانِ علوم نبوت کے لئے نافع ثابت ہو۔

ربنا تقبل منا إنک أنت السمیع العلیم.

خالد سیف اللہ رحمانی
(بیت الحمد، شاہین نگر، حیدرآباد)

۹؍شوال ۱۴۴۱ھ
۲؍جون ۲۰۲۰ء

• • •

آسان علم کلام

پہلا باب

علم کلام — تعارف اور اہمیت

بسم الله الرحمن الرحيم

لغوی اور اصطلاحی معنی

کلام کے معنی بات، گفتگو اور قول کے ہیں، نحو کی اصطلاح میں کلام ایک مکمل بات کو کہتے ہیں جس سے کسی واقعہ کی خبر یا کسی چیز کا مطالبہ معلوم ہو۔

اصطلاحی اعتبار سے علم کلام کی تعریف کے سلسلہ میں کسی قدر اختلاف پایا جاتا ہے؛ لیکن کوئی جوہری اختلاف نہیں ہے، زیادہ تر تعبیر کا اختلاف ہے، اس سلسلہ میں سب سے قدیم تعریف امام ابوحنیفہؒ (متوفی: ۱۵۰ھ) کی ہے۔

الفقه هو معرفة النفس ما يجوز لها من الاعتقادات والعمليات وما يجب عليها منهما ... وما يتعلق منها بالاعتقاديات ، هو الفقه الأكبر ، وما يتعلق بالعمليات فهو الفقه ۔ (۱)

فقہ انسان کا ان اعتقادات اور عملی احکام سے واقف ہونا ہے، جو اس کے لئے جائز ہیں، اور جو اس پر واجب ہیں......اس میں سے جو احکام اعتقادات سے متعلق ہوں، وہ ''فقہ اکبر'' ہے اور جو عملی مسائل سے متعلق ہوں، وہ ''فقہ'' ہے۔

فقہ اکبر سے مراد علم کلام ہے، اس تعریف سے علم کلام کی حقیقت اور اس کی فضیلت دونوں واضح ہوتی ہے، فضیلت یہ ہے کہ اسے فقہ کے مقابلہ میں 'فقہ اکبر' قرار دیا گیا ہے، اور حقیقت یہ واضح ہوئی کہ علم کلام اسلامی عقائد کی تشریح کا نام ہے، جس میں وہ عقائد بھی شامل ہیں جن کا یقین رکھنا انسان پر واجب ہے اور وہ بھی جن کا عقیدہ رکھنا جائز ہے، واجب نہیں۔

---

(۱) اشارات المرام من عبارات الامام للبیاضی: ۱۵۔

بعد کے اہل علم نے اس تعریف میں یہ اضافہ کیا ہے کہ صرف عقائد کو جان لینا ہی علم کلام نہیں ہے؛ بلکہ دلائل کی روشنی میں جاننے کا نام 'علم کلام' ہے؛ چنانچہ علامہ نجم الدین عمر ابوحفص نسفی ماتریدیؒ اور ان کی کتاب عقائد نسفیہ کی شرح میں علامہ سعد الدین تفتازانیؒ علم کلام کی حقیقت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں :

قد سموا ما يفيد ... معرفة العقائد عن أدلتها بالكلام ۔ (۱)

البتہ چوتھی صدی ہجری میں مشہور فلسفی ابونصر فارابیؒ (متوفی ۳۳۹ھ) نے اس تعریف میں مزید وسعت پیدا کی ہے؛ چنانچہ فرماتے ہیں :

صناعة الكلام يقتدر بها الإنسان على نصرة الآراء والأفعال المحدودة التى صرح بها واضع الملة وتزييف كل ما خالفها ۔ (۲)

اس تعریف میں ایجابی اور سلبی دونوں پہلو ہیں، یعنی علم کلام کے ذریعہ اسلامی عقائد کو ثابت بھی کیا جاتا ہے اور اس پر ہونے والے اعتراضات کا جواب بھی دیا جاتا ہے، گویا اس میں عقائد کی تشریح بھی ہے اور اس کا دفاع بھی؛ چنانچہ بعد کو امام غزالیؒ اور علامہ ابن خلدونؒ نے بھی علم کلام کی تعریف اور تشریح میں دونوں پہلوؤں کو پیش نظر رکھا ہے اور عام طور پر اہل علم نے اسی منہج کو اختیار کیا ہے، قاضی عضد الدین الایجی فرماتے ہیں :

علم يقتدر معه على إثبات العقائد الدينية بإيراد الحجج ودفع الشبهة عنها ۔ (۳)

علامہ ابن خلدونؒ فرماتے ہیں :

علم يتضمن الحجاج عن العقائد الإيمانية بالأدلة العقلية والرد على المنحرفين فى الاعتقادات ۔ (۴)

---

(۱) شرح العقائد النسفیۃ: ۱۰۔ (۲) احصاء العلوم: ۱/ ۸۶۔

(۳) کتاب المواقف: ۱/ ۳۱۔ (۴) تاریخ ابن خلدون: ۱/ ۵۸۰۔

علامہ ابن خلدونؒ کی اس تعریف میں خصوصی طور پر ادلہ عقلیہ کا ذکر کیا گیا ہے، ابتدائی دور میں علم کلام کی بنیاد ادلہ نقلیہ یعنی صرف نصوص پر ہوا کرتی تھی؛ لیکن فلسفہ سے متاثر مختلف فِرق منحرفہ کے پیدا ہونے کی وجہ سے متکلمین کو ادلہ عقلیہ کو بھی خصوصی اہمیت دینی پڑی، ابن خلدونؒ کی تعریف اس پہلو کو واضح کرتی ہے، بہر حال ان تعریفات کا خلاصہ یہ ہے :

علم کلام وہ علم ہے جس کے ذریعہ اسلامی معتقدات کو نقلی اور عقلی دلائل سے ثابت کیا جاسکے اور ان پر وارد ہونے والے اعتراضات خواہ وہ اسلام کی طرف منسوب منحرف فرقوں کی طرف سے ہوں، یا غیر مسلموں کی طرف سے، اُن کا رد کیا جاسکے۔

علم کلام کے مختلف نام

علم کلام کو مختلف ناموں سے موسوم کیا گیا ہے :

(۱) علم الفقہ الاکبر: اس نام سے امام ابوحنیفہؒ نے موسوم کیا ہے۔

(۲) علم کلام: تقریباً اسی دور میں اس علم کو علم کلام کا نام بھی دیا گیا ہے؛ چنانچہ امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام جعفر صادق — رحمہم اللہ — وغیرہ کی تحریروں میں کلام اور متکلمین کا ذکر ملتا ہے اور بعد کو یہی نام اس فن کے لئے معروف ہوگیا۔

اسے ''علم کلام'' کیوں کہتے ہیں؟ اس سلسلہ میں مختلف باتیں کہی جاتی ہیں :

(الف) عام طور پر متکلمین جیسے امام ابوالحسن الاشعریؒ یا قاضی عبدالجبار معتزلی وغیرہ اس علم کے مختلف مسائل پر بحث کرتے ہوئے ''الکلام فی کذا، الکلام فی کذا'' کا عنوان قائم کیا کرتے تھے۔

(ب) علم کلام میں جو مباحث آتے ہیں، ان میں اس مسئلہ کو بڑی شہرت حاصل ہوئی کہ کلام اللہ یعنی قرآن مجید مخلوق ہے یا غیر مخلوق؟ یہاں تک کہ امام احمد بن حنبلؒ کو اس کی وجہ سے بڑی آزمائش سے گزرنا پڑا؛ اس لئے اس کا نام ہی ''علم کلام'' پڑ گیا۔

(ج) متکلمین عام طور پر مخالفین کے ساتھ مناظرے کیا کرتے تھے اور ظاہر ہے کہ اس میں کلام اور قدرتِ کلام کی ضرورت پڑتی ہے؛ اس لئے یہ علم کلام کہلایا۔

(د) اس علم کی اہمیت کی وجہ سے اس کو ''علم کلام'' کہا گیا ہے، گویا کلام تو بہت ہیں؛ لیکن اصل میں کلام کہلانے کا مستحق یہی علم ہے۔

(ہ) فقہ کی بنیاد بھی شرعی دلیلوں پر ہے اور علم کلام کی بھی؛ لیکن فقہ میں عملی مسائل سے بحث ہوتی ہے اور کلام میں عملی مسائل سے بحث نہیں ہوتی؛ لہٰذا عمل کے مقابلے میں اس کو ''علم کلام'' سے موسوم کیا گیا۔

بہر حال ایسا نہیں ہے کہ کسی منصوبہ کے ساتھ کچھ لوگوں نے اتفاق رائے کر کے اس کا نام علم کلام رکھا ہو؛ بلکہ عام طور پر کسی علم کے لئے کوئی نام چل پڑتا ہے تو اس کے بار بار تذکرے کی وجہ سے وہ ایک اصطلاح کا درجہ حاصل کر لیتا ہے اور پھر اس اصطلاح کے لئے لغوی اور معنوی مناسبتیں تلاش کی جاتی ہیں، علم کلام نام رکھنے کی بھی یہی صورت حال ہے:

(۳) علم اُصول الدین: امام ابوالحسن الاشعریؒ نے علم کلام پر اپنی کتاب ''الابانۃ عن اُصول الدیانۃ'' کے نام سے لکھی ہے: ''اُصول الدیانۃ'' اُصول الدین کے معنی میں ہے، نیز علامہ عبدالقادر بغدادی اشعریؒ (متوفی: ۴۲۹ھ) نے علم کلام پر اپنی کتاب کا نام ہی 'اُصول الدین' رکھا ہے، اسی طرح عصام الدین طاش کبری زادہؒ (متوفی: ۹۶۸ھ) نے علوم وفنون کے تعارف پر اپنی شہرہ آفاق کتاب ''مفتاح السعادۃ'' میں علم کلام کی بحث پر اس طرح عنوان لگایا ہے: ''علم اصول الدین المسمی بعلم الکلام'' — آج کل عرب جامعات میں بھی عقائد سے متعلق شعبہ کو 'کلیۃ اُصول الدین' سے ہی موسوم کیا جاتا ہے۔

اس نام کی وجہ ظاہر ہے کہ اُصول کے معنی ''بنیادوں'' کے ہیں اور دین کی بنیاد عقائد پر ہے، جن سے کسی شخص کے مسلمان ہونے اور دائرہ اسلام سے باہر نکل جانے کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔

(۴) علم العقائد: اس نام کی مناسبت ظاہر ہے؛ کہ اس علم میں عقائد ہی سے بحث ہوتی

ہے، یہ نام بھی اہل علم کے درمیان مروج رہا ہے؛ چنانچہ امام ابوجعفر طحاویؒ (متوفی: ۳۲۱ھ) نے اپنی کتاب کا نام 'العقیدۃ الطحاویۃ' رکھا ہے، اسی طرح علامہ ابن تیمیہؒ (متوفی: ۷۲۸ھ) کی کتاب 'العقیدۃ الواسطیہ' ہے، امام غزالیؒ کی کتاب 'قواعد العقائد' ہے، علامہ نسفیؒ کی 'العقائد النسفیہ' ہے، جس کی شرح ہندوستان کی دینی جامعات میں داخل نصاب ہے؛ اسی لئے بعض عرب جامعات میں اس شعبہ کو 'قسم العقیدہ' بھی کہا جاتا ہے۔

(۵) علم التوحید والصفات: علامہ تفتازانی نے شرح عقائد نسفی کے مقدمہ میں ذکر کیا ہے کہ اس علم کو 'علم التوحید والصفات' بھی کہا جاتا ہے؛ کیوں کہ اس علم کی سب سے اہم بحث صفات باری تعالیٰ سے متعلق ہے اور صفات باری کے سلسلہ میں مختلف کلامی فرقوں کے درمیان جو اختلاف ہوا ہے، اس کی بنیاد عقیدۂ توحید اور صفات باری کی تشریح ہے۔

(۶) علم التوحید: علم کلام کی سب سے بنیادی بحث ''توحید'' کا عقیدہ ہے؛ اس لئے اس کو علم التوحید بھی کہتے ہیں، عصر حاضر میں اس نام کو خصوصی شہرت حاصل ہوئی ہے۔

(۷) علم النظر والاستدلال: علامہ سعد الدین تفتازانیؒ نے شرح عقائد کے مقدمہ میں اس علم کے لئے ایک اور نام ''علم النظر والاستدلال'' کا بھی ذکر کیا ہے، علم کلام ایسا علم ہے جس میں دلائل سے کسی امر کو ثابت کرنا اور کسی مخالف نظریہ کو رد کرنے کے لئے ''نظر'' یعنی گہرے غور وفکر اور دلائل قائم کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے، اس مناسبت سے یہ نام ہے۔

علم کلام کا موضوع

اسلامی احکام کی تقسیم درج ذیل طریقے سے ہوتی ہے :

(۱) اعتقادات: یعنی وہ احکام جن کا تعلق انسان کے قلب وضمیر سے ہے کہ انسان ان مغیبات کا یقین کرے جن کا اللہ کے رسولوں کے ذریعہ علم ہوا ہے۔

(۲) عبادات: یعنی وہ اعمال جو براہ راست خدا اور بندے کے تعلق کو ظاہر کرتے ہیں، جیسے: نماز، روزہ، حج، قربانی، نذر وغیرہ۔

(۳) مناکحات: یعنی رشتوں کی بنیاد پر شریعت میں مختلف لوگوں کے جو حقوق وفرائض متعین کئے گئے ہیں، ان سے متعلق احکام، جن کو آج کل عائلی قوانین، احوالِ شخصیہ یا پرسنل لا کہا جاتا ہے۔

(۴) معاملات: سماج کے مختلف افراد کے درمیان مالی لین دین کی بنیاد پر جو حقوق اور ذمہ داریاں متعلق ہوتی ہیں، ان کی وضاحت، جیسے: تاجر و گاہک، آجر و کرایہ دار وغیرہ۔

(۵) عقوبات: جرائم اور ان کی سزاؤں سے متعلق احکام۔

(٦) احکام سلطانیہ: یعنی حکومت و رعایا کے باہمی تعلقات اور ایک دوسرے سے متعلق حقوق اور ذمہ داریوں کو واضح کرنے والے احکام، تمام سیاسی اور عدالتی احکام اس کے ذیل میں آجاتے ہیں۔

(۷) سِیَر: صلح، امن، جنگ، بین ملکی اور بین قومی تعلقات وغیرہ سے متعلق احکام وقوانین۔

(۸) وہ ترغیبات واحکام جن کا تعلق فضائل اخلاق اور رزائل اخلاق سے ہے، جن کو اُردو میں ''اخلاقیات'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

ان احکام اور تعلیمات میں سے اخلاقیات کا حصہ صوفیاء نے لیا اور وہ 'علم الاخلاق' یا 'تصوف' کے نام سے موسوم ہوا، عبادات سے لے کر سِیَر تک وہ شرعی احکام وقوانین — جن کا تعلق انسان کی عملی زندگی سے ہے — کی تشریح وتوضیح کی ذمہ داری فقہاء نے قبول کی، اور یہ 'فقہ' کہلایا، اعتقادات جن کا تعلق دل ودماغ سے ماننے اور یقین کرنے سے ہے، ان کی تشریح وتوضیح متکلمین نے اپنے ذمہ لی اور یہ 'علم کلام' کہلایا۔

غرض کہ علم کلام کا موضوع اسلامی اعتقادات ہیں۔

متکلمین کے کام

اس سلسلہ میں متکلمین تین کام انجام دیتے ہیں :

اول : اسلامی عقائد کی وضاحت۔

دوم : ان عقائد پر نقلی و عقلی دلائل پیش کرنا۔

سوم : اس کے مخالف نقطۂ نظر کا رد۔

جس نقطۂ نظر کی تردید اور اس کے مقابلہ میں جس نظریہ کا اثبات مقصود ہوتا ہے، اس کے لحاظ سے متکلمین کے کاموں کی دو جہتیں ہوتی ہیں :

ایک: ان فرقوں کے مقابل اپنے نقطۂ نظر کا اثبات اور مخالف نقطۂ نظر کا رد، جو راہِ صواب سے منحرف ہیں ؛ لیکن وہ اسلام کے دائرہ میں ہیں، یا کم سے کم اپنے آپ کو اسلام کی طرف منسوب کرتے ہیں۔

دوسرے: ان لوگوں کے مقابلہ میں اپنے موقف کا اثبات اور مخالف موقف کی تردید، جن کو مسلمان ہونے کا دعویٰ نہیں، جیسے: ملحدین یا دوسرے ادیان کے ماننے والے لوگ۔

علم کلام کے مادحین

علم کلام ایک بلند رتبہ علم ہے یا قابل اجتناب ہے؟ اس سے اشتغال رکھنے والے لوگ قابل مدح ہیں یا لائق ذم ہیں؟ اس میں اہل علم کے درمیان خاصا اختلاف رہا ہے؛ بلکہ بعض اہل علم کی طرف دونوں طرح کی رائیں منسوب ہیں :

امام الحرمین عبد الملک جوینیؒ (۴۷۸ھ)، علامہ بیہقیؒ (۴۵۸ھ)، امام غزالیؒ (۵۰۵ھ)، امام نوویؒ (۶۷۶ھ)، علامہ ابن عساکرؒ (۵۷۱ھ)، علامہ طیبیؒ شارح مشکوٰۃ (۷۴۳ھ)، علامہ محلی شافعیؒ (۸۶۴ھ) وغیرہ نے علم کلام کے حاصل کرنے کو فرض کفایہ قرار دیا ہے؛ چنانچہ علامہ ابن حجر ہیثمی مکیؒ نے مشکوٰۃ شریف کی شرح میں لکھا ہے :

إنه آكد فروض الكفايات ؛ بل هو فرض عين إذا وقعت شبهة توقف حلها عليه ۔ (۱)

یہی رائے ائمہ اربعہ — امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ — کی طرف

(۱) فتح الادلۃ فی شرح المشکوٰۃ: ۱/۵۶۶۔

بھی منسوب کی گئی ہے؛ چنانچہ امام ابوحنیفہؒ نے تو اس موضوع پر ''الفقہ الاکبر'' کے نام سے مستقل کتاب ہی تالیف فرمائی ہے، امام احمدؒ نے ''الرد علی الجہمیہ'' لکھی ہے، امام شافعیؒ نے اعتقادی مسائل پر مناظرے کئے ہیں، امام مالکؒ نے ''استواء علی العرش'' کے مسئلہ پر روشنی ڈالی ہے، علم کلام کی اہمیت وفضیلت اور اس کے مخالفین پر رد کرنے کے لئے امام ابوالحسن الاشعریؒ نے ''استحسان الخوض فی علم الکلام'' کے نام سے مستقل کتاب تالیف کی ہے، امام غزالیؒ نے اس میں اشتغال کی مذمت بھی کی ہے؛ لیکن اس کی اہمیت بھی بتائی ہے، یہاں تک کہ اس کو فرض کفایہ قرار دیا ہے اور خود اس موضوع پر کتابیں لکھی ہیں۔

ان حضرات کے دلائل یہ ہیں :

(۱) اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا :

● وَ جَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۔(۱)

● قَالُوْا يٰنُوْحُ قَدْ جٰدَلْتَنَا فَاَكْثَرْتَ جِدَالَـنَا ۔ (۲)

● وَ تِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ ۔ (۳)

● اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِيْ رَبِّهٖٓ ۔ (۴)

علامہ ابن تیمیہؒ نے ان آیات سے ثابت کیا ہے کہ علم کلام بعض دفعہ واجب ہوگا اور بعض دفعہ مستحب، اور یہ شرعاً قابل مذمت نہیں ہوسکتا۔

ان آیات میں وجہ استدلال یہ ہے کہ جدال، حجت اور بحث ومباحثہ وغیرہ کا مقصد یہی ہے کہ اپنے موقف کو دلائل سے ثابت کیا جائے اور فریقِ مخالف کی باتوں کا دلیل سے رد کیا جائے، علم کلام کی حقیقت بھی یہی ہے۔

(۲) اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ وَّ يَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْۢ بَيِّنَةٍ ۔ (۵)

---

(۱) النحل:۱۲۵۔ (۲) ہود:۳۲۔

(۳) انعام:۸۳۔ (۴) بقرہ:۲۵۸۔ (۵) انفال:۴۲۔

جو ہلاک ہو وہ دلیل کے آجانے کے بعد ہلاک ہو، اور جو زندہ رہے،
وہ دلیل کی بنیاد پر زندہ رہے۔

یعنی اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کو اس لئے بھیجا ہے کہ جن لوگوں نے گمراہی کا راستہ اختیار کیا ہے، ان کے لئے یہ عذر باقی نہ رہے کہ ان کے سامنے کوئی دلیل نہیں آئی، اور جن لوگوں کو ہدایت کی توفیق ہو، ان کو پورا اطمینان ہو کہ ان کا نقطۂ نظر سچی دلیلوں پر قائم ہے، اور علم کلام اسی کا نام ہے کہ دلیل کے ذریعہ درست عقائد کو جانا جائے۔

(۳) قرآن مجید میں بے شمار مواقع پر وجود باری، توحید اِلٰہ، نبوت و وحی، رسالت محمدی اور آخرت وغیرہ پر عقلی دلیلیں بھی پیش کی گئی ہیں اور گذشتہ آسمانی کتابوں پر ایمان رکھنے والوں کے لئے ان کی کتابوں کے حوالہ سے نقلی دلیلیں بھی۔

(۴) عقل و قیاس کا تقاضا بھی یہی ہے کہ باطل کے مقابلہ میں حق کو ثابت کیا جائے اور باطل کا رد کیا جائے، اگر ایسا نہ کیا گیا تو لوگوں کے لئے حق تک پہنچنا اور باطل افکار سے بچنا دشوار ہو جائے گا؛ لہٰذا یہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں شامل ہے، جس کے واجب ہونے پر اُمت کا اجماع و اتفاق ہے۔

علم کلام کے ناقدین

اس کے برخلاف اہل علم کی ایک بڑی تعداد نے علم کلام کی مذمت بھی کی ہے، یہاں تک کہ علامہ خطابیؒ اور علامہ ابن تیمیہؒ نے اسے حرام قرار دیا ہے، علامہ عبد اللہ محمد الہرویؒ (۴۸۱ھ) نے ''ذم الکلام'' کے نام سے کتاب لکھی ہے، جس میں علم کلام کی مذمت کے سلسلہ میں سلف صالحین کے بہت سے اقوال نقل کئے ہیں، اسی طرح علامہ جلال الدین سیوطیؒ (۹۱۱ھ) نے ''صون المنطق والکلام عن فنی المنطق والکلام'' کے نام سے منطق اور کلام کی مذمت میں مستقل کتاب تالیف کی ہے۔

علامہ ابن تیمیہؒ نے اپنی معروف تالیف 'درء تعارض العقل والنقل' میں امام غزالیؒ نے

اپنی مختلف کتابوں خاص کر 'الجام العوام عن علم الکلام' میں اور ابن وزیرؒ (۸۴۰ھ) نے اپنی کتاب 'ترجیح اسالیب القرآن علی اسالیب الیونان' میں ایک درمیانی راستہ اختیار کرتے ہوئے علم کلام کے اس حصہ کو درست قرار دیا ہے، جس کی بنیاد کتاب وسنت پر ہے، اور اس کا وہ حصہ جس کی اساس منطق وفلسفہ پر ہے، کی مذمت کی ہے۔

جن حضرات نے علم کلام کی مذمت کی ہے، ان کے دلائل حسبِ ذیل ہیں :

(۱) اللہ تعالیٰ نے دین میں جدال سے منع فرمایا ہے۔

متکلمین اس کا جواب دیتے ہیں کہ ایسے جدال سے منع فرمایا گیا ہے جس کا مقصد باطل کی مدد کرنا ہو، اگر حق کے اظہار کے لئے جدال اور بحث ومباحثہ ہو تو اس کا تو قرآن میں حکم دیا گیا ہے :

وَ جَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۔ (۱)

(۲) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ ۔ (۲)

تو حکم تو ہے اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹانے کا؛ لیکن علم کلام میں بہت سی دفعہ عقل وقیاس کو دلیل بنایا جاتا ہے، اس طرح حکم قرآنی کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔

متکلمین نے اس کا جواب دیا ہے کہ جن مسائل میں کتاب وسنت کی نص موجود ہو، اس میں متکلمین بھی کتاب وسنت کی طرف رُجوع کرتے ہیں، جن اُمور میں نصوص موجود نہیں ہیں، ان میں اجتہاد یعنی عقل وقیاس کا سہارا لیا جاتا ہے؛ کیوں کہ یہ بھی قرآن وحدیث کا بتایا ہوا راستہ ہے کہ جن مسائل کے بارے میں کتاب وسنت کی صراحت موجود نہ ہو، وہاں قیاس واجتہاد سے کام لیا جائے۔

---

(۱) نحل: ۱۲۵۔　　(۲) النساء: ۵۹۔

(۳) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

هُوَ الَّذِیٓ اَنۡزَلَ عَلَیۡكَ الۡكِتٰبَ مِنۡهُ اٰیٰتٌ مُّحۡكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الۡكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ فَاَمَّا الَّذِیۡنَ فِیۡ قُلُوۡبِهِمۡ زَیۡغٌ فَیَتَّبِعُوۡنَ مَا تَشَابَهَ مِنۡهُ ابۡتِغَآءَ الۡفِتۡنَةِ وَابۡتِغَآءَ تَاۡوِیۡلِهٖ وَمَا یَعۡلَمُ تَاۡوِیۡلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ وَالرّٰسِخُوۡنَ فِی الۡعِلۡمِ یَقُوۡلُوۡنَ اٰمَنَّا بِهٖ كُلٌّ مِّنۡ عِنۡدِ رَبِّنَا وَمَا یَذَّكَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الۡاَلۡبَابِ ۔ (۱)

علم کلام کی مذمت کرنے والوں کا استدلال یہ ہے کہ اس آیت میں متشابہات میں پڑنے سے منع کیا گیا ہے اور علم کلام میں متشابہات ہی زیر بحث آتے ہیں جیسے: اللہ تعالیٰ کی صفات وغیرہ۔

متکلمین کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ایسی متشابہات میں پڑنے سے منع کیا ہے، جن کا عقل سے ادراک نہیں کیا جا سکتا، یا جو انسان کے فہم سے ماوراء ہے، جیسے: اللہ تعالیٰ کی ذات، مسئلہ تقدیر وغیرہ؛ لیکن عقائد کی تمام بحثیں متشابہات میں شامل نہیں ہیں اور خود قرآن مجید میں بار بار صفات باری تعالیٰ اور دوسرے معتقدات کا ذکر فرمایا گیا ہے۔

(۴) صحابہؓ کا دور خیر القرون تھا، وہ سب سے بڑھ کر دین سے واقف بھی تھے اور اس کے ناصر و مددگار بھی، انھوں نے فقہ وفتاویٰ کی طرف تو توجہ کی؛ لیکن علم کلام سے کوئی شغف نہیں رکھا؛ اس لئے یہ ایک بدعت اور گمراہی ہے۔

متکلمین اس کا جواب دیتے ہیں کہ صحابہؓ کا اس علم سے اشتغال نہیں رکھنا اور بعد کے سلف صالحین کا اس میں مشغول ہونا ضرورت اور حالات کے اعتبار سے ہے؛ چنانچہ امام ابوحنیفہؒ سے منقول ہے کہ اس علم کے بارے میں صحابہ اور بعد کے عہد کی مثال ایسی ہی ہے کہ اگر کسی کے سامنے دشمن برسر پیکار ہو تو وہ ہتھیار استعمال کر سکتا ہے اور جس کے سامنے کوئی ایسا

---

(۱) آل عمران: ۷۔

دشمن نہ ہو اس کو ہتھیار رکھنے کی ضرورت نہیں ہوتی، عہد صحابہ میں ایسے فرق باطلہ موجود نہیں تھے، جن کے خلاف بحث و استدلال کی ضرورت ہو، اور ہمارے دور میں ایسے لوگ موجود ہیں؛ اس لئے ضروری ہے کہ ہم علم کلام کے ہتھیار سے مسلح ہوں، اس کے علاوہ صحابہؓ نے بھی اپنے زمانہ کے نو پید باطل فرقوں —— قدریہ اور خوارج —— کے بارے میں گفتگو فرمائی ہے اور نقلی و عقلی دلائل سے ان کا رد کیا ہے۔

(۵) اُمت کے بڑے بڑے علماء اور مجتہدین نے علم کلام کی مذمت کی ہے، امام ابوحنیفہؒ کے بارے میں منقول ہے کہ انھوں نے اپنے صاحبزادہ حمادؒ کو علم کلام میں اشتغال سے منع فرمایا تھا، امام شافعیؒ نے فرمایا: ''کسی شخص نے علم کلام سے تعلق کی بنیاد پر کامیابی حاصل نہیں کی''، اسی طرح کی بات امام مالکؒ اور امام احمد بن حنبلؒ وغیرہ سے بھی منقول ہے۔

متکلمین اس کا جواب دیتے ہیں کہ سلف صالحین کا مقصد مطلقاً علم کلام سے اجتناب کرنا نہیں ہے؛ کیوں کہ خود ائمہ اربعہ نے علم کلام پر کتابیں لکھی ہیں، یا مناظرے کئے ہیں، امام ابوحنیفہؒ نے جب اپنے صاحبزادہ حمادؒ کو علم کلام سے منع کیا تو انھوں نے دریافت کیا: آپ خود اس علم سے تعلق رکھتے ہیں اور مجھے منع کر رہے ہیں؟ امام صاحبؒ نے فرمایا: ہم لوگ جب ان مسائل پر مباحثہ کرتے تھے تو ہم اس ڈر سے کہ کہیں فریق مخالف غلطی میں نہ پڑ جائے، ایسا سہمے رہتے تھے کہ گویا ہمارے سروں پر پرندہ بیٹھا ہوا ہے، اور تم لوگ بحث کرتے ہو تو چاہتے ہو کہ فریق مخالف غلطی میں پڑ جائے اور اس کی تکفیر کی جائے، اور جس نے دوسرے کے بارے میں چاہا کہ وہ کفر میں پڑ جائے، وہ خود کافر ہو گیا، اسی طرح کی باتیں امام شافعیؒ اور امام احمدؒ وغیرہ سے بھی منقول ہیں۔

علم کلام کے سلسلہ میں اہل علم کے درمیان جو شدید اختلاف پایا جاتا ہے، اس کی بنیاد یہ سمجھ میں آتی ہے کہ یہ علم مختلف ادوار سے گزرا ہے، ابتدائی دور میں ان فرقوں کے رد کی طرف توجہ کی گئی، جو اسلام کی طرف منسوب تھے اور جو کتاب اللہ اور سنت رسول کو تسلیم کرتے تھے؛

اس لئے ساری بحث کتاب و سنت کے ذریعہ ہوتی تھیں ، پھر جب ایران کا علاقہ فتح ہوا اور یہاں کے بہت سے لوگ مسلمان ہوئے ،تو یہ لوگ پہلے سے ایرانی افکار اور یونانی فلسفہ سے متاثر تھے، اس کی وجہ سے بعض ایسے مسائل علم کلام کا حصہ بن گئے ، جو یونانی فلسفہ سے متاثر حضرات کی طرف سے اسلام کے خلاف اعتراضات کا جواب تھے،اس کے لئے متکلمین نے منطق وفلسفہ کے اُصولوں اور ان کے طرز استدلال سے فائدہ اُٹھایا۔

اس استدلال میں بعض دفعہ غلو کی کیفیت پیدا ہوجاتی تھی؛ کیوں کہ بعض حضرات منطق وفلسفہ کے اُصول کو اصل مان کر اسلامی معتقدات کی توجیہ کیا کرتے تھے ، یہاں تک کہ بعض اوقات شرعی نصوص کے مقابلہ میں عقل و قیاس کو ترجیح دی جاتی تھی ، اس کی وجہ سے سلف صالحین کو متکلمین کے طرز استدلال سے اختلاف ہوا؛اس لئے جو بات درست معلوم ہوتی ہے: وہ یہ ہے کہ جیسے آیاتِ احکام اور احادیثِ احکام کی تشریح کا نام فقہ ہے اور جیسے فضائل ورزائل اخلاق سے متعلق آیات واحادیث تصوف اور علم الاخلاق کا موضوع ہیں ، اسی طرح جو آیات واحادیث عقائد وایمانیات سے متعلق ہیں ، یا جن کا مقصد اسلامی معتقدات پر واقع ہونے والے اعتراضات کا رد ہے، ان ہی کی تشریح وتوضیح کا نام علم کلام ہے؛اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ علم فقہ اور علم الاخلاق تو قابل تحسین علم قرار پائیں اور علم کلام قابل مذمت ہو؛ البتہ یہ ضروری ہے کہ علم کلام میں استدلال کی اصل بنیاد قرآن وحدیث ہو کو بنانا چاہئے اخذ و استدلال کا جو طریقہ فقہاء نے اختیار کیا ہے، وہی طریقہ عقائد میں بھی اختیار کرنا چاہئے ،اہل سنت کے مختلف مکاتب فکر ـــــ اشاعرہ ، ماتریدیہ اور حنابلہ ـــــ نے بنیادی طور پر یہی اُسلوب اختیار کیا ہے، خاص کر موجودہ دور میں اعداء اسلام کی طرف سے اسلام پر جو اعتراضات کئے جاتے ہیں، اگر قدیم متکلمین کی طرح ان کی مدافعت کو بھی اسلام کا حصہ بنا دیا جائے تو یہ بے حد اہم کام ہوگا، حقیقت یہی ہے کہ یہ ایک اہم ترین علم ہے، جو اسلامی علوم میں بڑی وقعت کا حامل ہے اور اس کی ضرورت ہمیشہ سے رہی ہے اور آئندہ بھی رہے گی۔

تمرینی سوالات

(۱) امام ابوحنیفہؒ نے علم کلام کی کیا تعریف کی ہے؟ اور علم کلام کی تمام جہتوں کو شامل کرتے ہوئے اس کی جامع تعریف کس طرح کی جاسکتی ہے؟

(۲) علم کلام کو کن کن ناموں سے موسوم کیا گیا ہے اور اس علم کو علم کلام کہنے کی وجہ کیا ہے؟

(۳) علم کلام کا موضوع کیا ہے؟

(۴) متکلمین کیا کیا خدمت انجام دیتے ہیں؟

(۵) جن لوگوں نے علم کلام کو قابل مدح قرار دیا ہے، ان میں چند کے نام لکھئے اور ان کے دلائل ذکر کیجئے۔

(۶) جن حضرات نے علم کلام کی مذمت کی ہے، ان میں سے بعض کے اسماء بتائیے۔

(۷) علم کلام کے مذموم ہونے پر جو دلائل پیش کئے جاتے ہیں، متکلمین نے ان کے کیا جوابات دیئے ہیں؟

(۸) علم کلام کے قابل مدح یا لائق مذمت ہونے کے سلسلے میں راجح قول کیا ہے؟



دوسرا باب

علم کلام — آغاز و ارتقاء

علم کلام کواس کی تدوین وارتقاء کے اعتبار سے پانچ ادوار پر تقسیم کیا جا سکتا ہے :

(۱) ابتدائی مرحلہ: پہلی دوسری صدی ہجری کا ہے۔

(۲) دوسرا مرحلہ: تیسری صدی ہجری سے تقریباً پانچویں صدی ہجری کے ختم تک یعنی چار صدیوں کا ہے، یہ اس علم کی تدوین کا اور مختلف اعتقادی فرقوں کے ظہور کا زمانہ ہے۔

(۳) تیسرا مرحلہ: جو چھٹی صدی ہجری سے نویں صدی ہجری تک کا احاطہ کرتا ہے، اس میں اس فن کو ترقی حاصل ہوئی اور اس میں یونانی فلسفہ کے بہت سے مسائل بھی داخل ہوگئے۔

(۴) چوتھا مرحلہ: دسویں صدی ہجری سے بارہویں صدی ہجری کے ختم تک ہے، جس میں کوئی خاص اضافہ نہیں ہوا۔

(۵) پانچواں مرحلہ: تیرہویں صدی ہجری کے آغاز سے اب تک کا ہے، جس میں عالم اسلام پر مغربی استعمار کے غلبہ کی وجہ سے بعض نئے کلامی مسائل پیدا ہوئے۔

پہلا مرحلہ

اسلام کے ابتدائی دور میں اعتقادی مسائل پر بحث ومباحثہ کی ضرورت نہیں تھی، قرآن وحدیث میں جو بات جس طرح وارد ہوئی ہے، اس کو اسی طرح قبول کیا جاتا تھا اور اس کی تحقیق میں جانے کو غیر ضروری تصور کیا جاتا تھا؛ لیکن خلافت راشدہ کے ختم ہوتے ہوتے اعتقادی بحثیں شروع ہوگئیں، اختلاف رائے میں بتدریج شدت پیدا ہوتی گئی، یہاں تک کہ کئی اعتقادی فرقے وجود میں آگئے؛ تاہم اس دور میں استدلالی اعتبار سے علم کلام کی بنیاد کتاب اللہ اور سنت رسول پر قائم تھی اور عقلی بحثوں یا فلسفیانہ نظریات کا اس میں دخل نہیں ہوا تھا، اسی دور میں تین اہم مسائل پیدا ہوئے، اور ان مسائل کی وجہ سے بعد میں کئی اعتقادی فرقے وجود میں آئے۔

گناہ کبیرہ کا مرتکب

پہلا مسئلہ یہ تھا کہ اگر کوئی شخص گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرلے تو وہ مسلمان باقی رہتا ہے یا نہیں؟ کیا اس کی وجہ سے وہ کفر کے دائرہ میں آجاتا ہے؟ بعد کے ادوار میں اسی اختلاف کی بنا پر یہ بحث چھڑ گئی کہ ایمان میں اعمال کی کیا حیثیت ہے؟ کیا اعمال صالحہ کو چھوڑنے کی وجہ سے انسان ایمان سے محروم ہوجاتا ہے؟ یا اعمال کی حیثیت ایمان کی وجہ سے پیدا ہونے والے آثار کی ہے، جن کے فوت ہونے کی وجہ سے انسان گناہ گار تو ہوتا ہے؛ لیکن دائرہ ایمان سے باہر نہیں جاتا؟ یہ مسئلہ اس وقت کھڑا ہوا، جب سیدنا حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے درمیان اختلاف پیدا ہوا اور جنگ کی نوبت آگئی، پھر ایک مرحلہ پر دونوں نے مل کر صلح کرنے کی کوشش کی اور اس کے لئے دو حضرات کو حَکم بنایا گیا کہ وہ جو بھی فیصلہ کریں، دونوں فریق اس کو تسلیم کریں گے۔

اس وقت حضرت علیؓ کے مؤیدین کا ایک بڑا گروہ جس کا تعلق عراق سے تھا، نہ صرف یہ کہ حضرت علیؓ سے الگ ہوگیا اور بغاوت کی راہ اختیار کی؛ بلکہ اس نے دونوں فریقوں کو کافر قرار دے دیا؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: ''اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ'' (یوسف: ۴) یعنی صرف اللہ تعالیٰ ہی کو فیصلہ کا حق حاصل ہے، ان حضرات کے خیال کے مطابق دونوں فریقوں نے دو افراد کو حَکم تسلیم کرکے اس حکم قرآنی کی مخالفت کی، گناہ کبیرہ کے مرتکب ہوئے — نعوذ باللہ — اور اس کی وجہ سے کافر و مرتد قرار پائے، اور اسی لئے ان کا قتل جائز قرار پایا، اس فرقہ کو 'خوارج' اور جس مقام سے ان کا تعلق تھا، اس کی نسبت سے 'حروریہ' کہا گیا، حضرت علیؓ کو ان سے باضابطہ جنگ کرنی پڑی، حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا ان سے مناظرہ ہوا، انھوں نے سیدنا حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ دونوں کے قتل کی سازش رچی، حضرت امیر معاویہؓ تو بچ گئے؛ کیوں کہ اتفاق سے اس دن وہ فجر کی نماز میں نہیں آسکے تھے اور حضرت علیؓ ٹھیک نمازِ فجر میں شہید کردیئے گئے۔

اس مسئلہ میں بالآخر تین فریق ہوگئے، ایک فریق خوارج کا، جو گناہ کبیرہ کے مرتکب کو

کافر قرار دیتے ہیں، ان سے قریب قریب معتزلہ ہیں، جو کہتے ہیں کہ ایسا شخص مومن تو باقی نہیں رہتا؛ لیکن کافر بھی نہیں ہوتا، یعنی ان کے نزدیک ایمان اور کفر کے درمیان ایک اور درجہ ہے، دوسری انتہاء پر 'مرجئیہ' ہیں جن کے نزدیک نجات کے لئے ایمان کافی ہے، اعمالِ صالحہ ضروری نہیں ہیں، گناہ کبیرہ کے ارتکاب پر جو وعیدیں منقول ہیں، وہ ان کی تاویل کرتے ہیں، اہل سنت والجماعت نے اعتدال اور میانہ روی کا راستہ اختیار کیا کہ مسلمان اور کافر ہونے کا مدار تو ایمانیات پر ہے؛ لیکن کبائر کے ارتکاب سے انسان فاسق اور گنہگار ہو جاتا ہے اور وہ آخرت میں دوزخ کی عارضی سزا کا مستحق ہے؛ لیکن اگر اللہ چاہیں تو اسے معاف فرمادیں۔

یہ اختلاف بعد میں بہت گہرا ہوتا گیا، مگر اس کی بنیاد اسی عہد میں پڑ گئی تھی، خوارج کے بنیادی طور پر دو فرقے ہو گئے۔

ایک وہ غالی خوارج، جنھوں نے اپنے مخالفین کو کافر اور مباح الدم قرار دے دیا، یہاں تک کہ ان کی عورتوں اور بچوں کے قتل کرنے کو جائز ٹھہرایا، اور جو لوگ ان سے تعاون نہ کریں، ان کو بھی کافر کہا، یہ ''ازارقہ'' کہلائے؛ کیوں کہ یہ لوگ نافع بن ازرق کے متبعین تھے اور ان ہی کی قیادت میں بصرہ سے اَہواز کی طرف چلے گئے تھے، وہاں انھوں نے اپنی حکومت قائم کی اور آہستہ آہستہ یہ فرقہ ختم ہو گیا۔

دوسرا فرقہ 'اباضیہ' ہے، جو اپنی نسبت عبداللہ بن اِباض کی طرف کرتا ہے، یہ دوسرے مسلمانوں کو کافر تو کہتے ہیں؛ لیکن ان کے یہاں کفر کی ایک اور اصطلاح ہے، اور وہ یہ کہ یہ دین کے اعتبار سے کافر نہیں ہیں؛ بلکہ کفرانِ نعمت کے اعتبار سے کافر ہیں، یہ فرقہ ابھی بھی عمان اور بعض افریقی ممالک میں موجود ہے اور دوسرے مسلمانوں کے ساتھ مل جل کر رہتا ہے۔

جبر واختیار

دوسرا مسئلہ جو اس عہد میں پیدا ہوا وہ ''جبر اور اختیار'' کا مسئلہ ہے، اگر ہم غور کریں تو ایک طرف انسان مجبور ہے، اللہ کی مشیت کے بغیر وہ کوئی کام نہیں کر سکتا، دوسری طرف اس کو

ارادہ واختیار کی طاقت دی گئی ہے، جس سے وہ سارے کاموں کو انجام دیتا ہے، اس سلسلہ میں دو انتہا پسندانہ نظریات پیدا ہوئے، ایک گروہ ’قدریہ‘ کہلایا، جن کا تصور یہ تھا کہ انسان اپنے تمام اعمال پر خود قادر ہے، اس کو کسی عمل کے انجام دینے میں مشیتِ الٰہی کے تعاون کی ضرورت نہیں، اس کے بالمقابل دوسرے گروہ کا نقطہ نظر یہ ہے کہ انسان مجبور محض ہے، کسی درخت کے پتے کا ہلنا اور انسان کا کسی عمل کو انجام دینا برابر ہے، جو کچھ ہوتا ہے، وہ اللہ ہی کے کرنے سے ہوتا ہے، ان کو ’جبریہ‘ کہا جاتا ہے، قدریہ کی فکر اللہ تعالیٰ کے عجز کو مستلزم ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی مشیت کے بغیر اپنی خواہش کو روبہ عمل لاسکتا ہے، اور جبریہ کی فکر اللہ تعالیٰ کی طرف ظلم کی نسبت کو مستلزم ہے کہ جب انسان کوئی عمل اپنی قدرت سے کر ہی نہیں سکتا تو پھر اس کو سزا دینا بے معنی ہے، یہ دونوں فرقے آہستہ آہستہ ختم ہوگئے، قدریہ کے مقتدی معبد جہنی اور جبریہ کے پیشوا جہم بن صفوان تھے، دونوں بنواُمیہ کے ہاتھوں مارے گئے۔

اہل سنت والجماعت کا نقطہ نظر ان دونوں سے الگ ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ارادہ واختیار کی قوت دی ہے، جس کو ’’کسب‘‘ کہتے ہیں؛ لیکن یہ قوت اللہ تعالیٰ کی مشیت کی مدد کے بغیر کام نہیں آسکتی، مثلاً ایک شخص کو اس بات کی قوت دی گئی ہے کہ وہ چاہے تو اپنے چلنے کی طاقت کو مسجد جانے کے لئے استعمال کرے اور چاہے تو شراب خانہ جانے کے لئے، پھر جب انسان مسجد جانے کا ارادہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی مشیت مددگار بنتی ہے اور انسان مسجد پہنچ جاتا ہے، اور اگر وہ شراب خانہ جانے کا ارادہ کرتا ہے تو اس میں بھی اللہ کی مشیت شامل ہوجاتی ہے اور وہ گناہ کے مرکز تک پہنچ جاتا ہے، اس طرح انسان کو ایک گونہ قدرت حاصل ہے، جس کی وجہ سے اس سے ثواب وعذاب کا حکم متعلق ہوتا ہے، اور ایک گونہ وہ مجبور بھی ہے کہ اللہ کی مشیت کے بغیر وہ اپنے کسی ارادہ کو پورا نہیں کرسکتا؛ البتہ اللہ کے علم میں پہلے سے یہ بات ہے کہ کون اپنی قوت کو کس مقصد کے لئے استعمال کرے گا اور اس کا کیا نتیجہ مرتب ہوگا؟ اسی اعتبار سے اس کی تقدیر لکھ دی گئی ہے، یعنی تقدیر علم الٰہی کا نام ہے نہ کہ کسی انسان کو کسی خاص عمل پر مجبور کرنے کا، یہ ایسا ہی ہے جیسے استاذ کسی طالب علم کے بارے میں کہہ دے کہ یہ اعلیٰ نمبر

سے کامیاب ہوگا اور دوسرے بدشوق طالب علم کے بارے میں کہے کہ یہ فیل ہوجائے گا، اب اتفاق سے اسی پیشین گوئی کے مطابق پہلا طالب علم اعلیٰ درجہ سے کامیاب ہوا اور دوسرا فیل ہوگیا، تو یہ نہیں کہا جاسکتا کہ استاذ کے کہنے کی وجہ سے ان کے نتائج اس طرح آئے ہیں؛ بلکہ یہ خودان کی تعلیم سے دلچسپی اور عدم دلچسپی کا نتیجہ ہے، فرق یہ ہے کہ انسان کا علم ناقص ہے، اس لئے وہ جو رائے قائم کرتا ہے، بعض اوقات غلط ثابت ہوتی ہے، اور اللہ تعالیٰ کا علم کامل ہے؛ اس لئے اللہ تعالیٰ نے جو بات لکھ دی ہے، اس کے خلاف کوئی امر پیش نہیں آسکتا۔

امامت

تیسرا مسئلہ جو اس عہد میں پیدا ہوا وہ 'امامت' کا ہے، رسول اللہ ﷺ کی وفات ہوگئی؛ لیکن آپ ﷺ نے صراحت کے ساتھ آئندہ کے لئے کسی کو اپنا خلیفہ نامزد نہیں فرمایا، آپ ﷺ کے بعد جب خلیفہ کا انتخاب ہوا تو اس سلسلہ میں تھوڑا سا اختلاف رائے ضرور پیدا ہوا؛ لیکن پھر تمام صحابہ بشمول حضرت علیؓ، حضرت ابوبکرؓ کی خلافت پر متفق ہوگئے، اس کی طرف ایک اشارہ خود حضور ﷺ نے فرما دیا تھا کہ مرض وفات میں آپ ﷺ نے اپنی جگہ نماز کی امامت کے لئے حضرت ابوبکرؓ کو نامزد فرمایا تھا؛ چنانچہ بعض صحابہؓ نے اسی سے استدلال کیا کہ جب ہماری امامت صغریٰ کے لئے حضرت ابوبکرؓ کا انتخاب فرمایا گیا تو ہماری امامت کبریٰ کے لئے بھی ان ہی کی شخصیت موزوں ہوسکتی ہے، حضرت ابوبکرؓ نے صحابہ کے مشورہ سے اپنے بعد کے لئے حضرت عمرؓ کو خلیفہ نامزد کیا اور حضرت ابوبکرؓ کی وفات کے بعد تمام مسلمانوں نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی، اس طرح باتفاق رائے ان کا انتخاب بھی عمل میں آیا، حضرت عمرؓ کے بعد صحابہؓ کے ایک گروہ کا رجحان حضرت عثمان غنیؓ کی جانب تھا اور ایک گروہ کا حضرت علیؓ کی طرف؛ لیکن کثرت آراء کی بنیاد پر حضرت عثمانؓ کا انتخاب ہوا، حضرت عثمانؓ بنواُمیہ میں سے تھے۔

بنواُمیہ اور بنو ہاشم کے درمیان پہلے سے چشمک رہا کرتی تھی، پھر عبد اللہ بن سبا جو اصل میں مذہباً یہودی تھا، اس نے اسلام کا لبادہ اوڑھ کر اس اختلاف کو بڑھاوا دینے کی

کوشش کی ، یہاں تک کہ حضرت عثمان غنیؓ کی شہادت کا سانحہ پیش آیا، پھر صحابہؓ کے اصرار پر سیدنا حضرت علیؓ نے بیعت لی اور باتفاق رائے وہ چوتھے خلیفہ راشد منتخب ہوئے ، جن لوگوں نے ان سے اختلاف کیا، وہ بھی یہ نہیں کہتے تھے کہ حضرت علیؓ خلافت کے مستحق نہیں ہیں، یا ان کے مقابل میں کوئی دوسرا شخص مسلمانوں کی امارت کا زیادہ اہل ہے؛ لیکن ان کا مطالبہ یہ تھا کہ حضرت عثمانؓ کے قاتلین پر قصاص جاری کیا جائے ، بہرحال اس اختلاف کے باوجود صحابہؓ وتابعینؒ اس بات پر متفق رہے کہ ’ خلافت‘ نبوت کی طرح ایسا عہدہ نہیں ہے، جو شارع کی طرف سے منصوص ہو، نیز خلیفہ کی حیثیت عام انسانوں میں سے ایک انسان کی ہوتی ہے، وہ انبیاءکرام کی طرح معصوم اور غلطی سے محفوظ نہیں ہوتا۔

لیکن عراق میں موجود حضرت علیؓ کے کچھ حامیوں نے اپنے سیاسی موقف کو مضبوط کرنے کے لئے اس کو مذہبی رنگ دیتے ہوئے یہ تصور دیا کہ خلافت عام مسلمانوں کے انتخاب سے قائم نہیں ہوتی ؛ بلکہ شارع کی طرف سے منصوص ہوتی ہے اور امام معصوم ہوتا ہے، نیز امامت اسلام کے بنیادی احکام میں سے ہے، یہاں تک کہ وہ ارکان خمسہ ،کلمہ شہادت ،نماز ، روزہ ، حج اور زکوٰۃ کے ساتھ ایک چھٹا رکن ’’امامت‘‘ کا اضافہ کرتے ہیں، ان کے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی طرف سے خلافت کے لئے حضرت علیؓ نامزد تھے،اس لئے وہی خلافت کے مستحق تھے اور ان کے بعد بھی امامت حضرت علیؓ کی اولاد میں ہی متعین ہے، یہ ایک سیاسی اختلاف تھا، جس نے مذہبی اختلاف کی صورت اختیار کرلی اور بعد کو اس سے بہت سے فرقے پیدا ہوتے چلے گئے، جن میں سے اس وقت سب سے بڑا فرقہ ’امامیہ‘ ہے، جن کو ’اثنا عشریہ‘ بھی کہا جاتا ہے اور جن کا مرکز ایران وعراق ہے۔

اس کے علاوہ اکثر فرقے اب نہیں پائے جاتے سوائے چند کے، ایک ’’اسماعیلیہ‘‘ جو امام جعفر صادقؒ کے صاحبزادے اسماعیل کی طرف منسوب ہیں، بعد میں یہ فرقہ دو حصوں میں بٹ گیا، ان میں ایک وہ ہیں، جو’’ آغا خانی‘‘ کہلاتے ہیں، اور دوسرے فرقہ کو’’بوہرہ‘‘ کہا جاتا ہے، دوسرا فرقہ نصیریہ کا ہے، جو’’علویہ‘‘ بھی کہلاتے ہیں، ان کے یہاں امام گویا خدا کا نمائندہ

ہوتا ہے، یہاں تک کہ وہ حلال وحرام کرنے کا بھی اختیار رکھتا ہے، شام میں اس وقت ان کی حکومت ہے، تیسرا گروہ ’’زیدیہ‘‘ کا ہے، جو اپنی نسبت زید بن علی بن حسینؓ کی جانب کرتا ہے، یہ شیعوں میں سب سے زیادہ معتدل گروہ ہے، یہ اگرچہ حضرت علیؓ کو خلفائے ثلاثہ سے افضل قرار دیتے ہیں؛ لیکن ان کے نزدیک یہ واجب نہیں ہے کہ جو شخص امامت کا زیادہ حقدار ہو وہی امام بنے؛ بلکہ افضل کی موجودگی میں مفضول بھی مسلمانوں کا امام بن سکتا ہے؛ لہٰذا خلفائے ثلاثہ کی خلافت کو وہ درست مانتے ہیں اور عام صحابہؓ کی تکفیر نہیں کرتے۔

دوسرا مرحلہ

دوسرا مرحلہ تدوین اور مختلف فرقوں کے ظہور کا دور ہے، بعض فرقے جن کا اوپر ذکر آیا ہے، اگرچہ وہ ان مسائل کی بنیاد پر وجود میں آئے تھے، جو قرن اول میں پیدا ہوئے؛ لیکن ان کی باضابطہ شکل اور ایک فرقہ کی حیثیت سے ان کی پہچان اسی دوسرے دور میں قائم ہوئی، اس دور کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے کہ یہ مختلف کلامی فرقوں کے منظم ہونے کا عہد ہے، جو اعتقادی فرقے اس دور میں پیدا ہوئے ان کی تعداد تو بہت زیادہ ہے؛ لیکن ان میں سے بعض اہم فرقے جو اَب تک موجود ہیں، یا جو ایک زمانے تک عالم اسلام کی فضا پر چھائے رہے، یہاں ان کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

بنیادی طور پر یہ کلامی فرقے دو قسم کے ہیں، ایک وہ جو زیادہ سے زیادہ نصوص کے الفاظ کے مطابق عقائد کی تشریح کرتے ہیں، اس کی ایسی تعبیر سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں، جس کی وجہ سے لفظ کے متبادر معنی کو چھوڑنا پڑے، اور اس کو استعارہ اور کنایہ مان کر غیر متبادر معنی متعین کرنا پڑے، اگرچہ ظاہری معنی پر اکتفا کرنا بظاہر ایک اچھی بات معلوم ہوتی ہے؛ لیکن اس میں غلو انسان کو اس حد تک لے جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لئے جسم ماننا پڑے اور خالق کو مخلوق کے مشابہ قرار دیا جائے، اس اُصول کو اعتدال یا غلو کے ساتھ استعمال کرنے کی وجہ سے پانچ فرقے وجود میں آئے :

۱- حَشویہ

حَشو کے معنی کسی چیز کو داخل کرنے کے ہیں، کہا جاتا ہے کہ یہ گروہ حدیث میں بہت سی ایسی باتوں کو داخل کر دیتا تھا، جس کی کوئی اصل نہیں؛ اسی لئے لوگ ان کو "حشویہ" کہنے لگے۔

ان کے منہج فکر میں دو باتیں بنیادی اہمیت کی حامل ہیں :

اول: وہ اعتقادات کو جاننے کے لئے صرف نصوص پر اکتفا کرنے کے قائل تھے، ان کے نزدیک عقل اور عقلی دلیلوں کا اس میں کوئی دخل نہیں۔

دوسرے: وہ نصوص کو بالکل اس کے لفظی معنی اور نظر آنے والی شکل میں قبول کرتے تھے، جیسے: اللہ تعالیٰ کے لئے ہاتھ، پاؤں یا چہرے کا ذکر آیا ہے، تو وہ اللہ تعالیٰ کے لئے ان اعضا کے مادی وجود کو مانتے تھے، گویا ان کا عقیدہ تجسیم اور تشبیہ تک پہنچ جاتا ہے۔

محققین کا خیال ہے کہ چوں کہ تورات میں اللہ تعالیٰ کے لئے باضابطہ جسم مانا گیا ہے، یہاں تک کہ خدا تھک جاتا ہے، اس کو آرام کی ضرورت ہوتی ہے، وہ کُشتی بھی لڑتا ہے اور اس میں شکست بھی کھا جاتا ہے تو چوں کہ بعض یہود و نصاریٰ اور مجوسی اسلام کے ابتدائی عہد میں بظاہر مسلمان ہو گئے؛ لیکن اپنے گذشتہ افکار و معتقدات کو چھپائے رہے، ان ہی کے ذریعہ یہ فکر مسلمانوں میں پھیلی اور اسی سے یہ مکتب فکر وجود میں آیا؛ تاہم یہ کبھی بھی ایک منظم فرقہ کی صورت میں نہیں رہا، جس کے کچھ متعین پیشوا ہوں اور ان کے نقطہ نظر پر کتابیں ہوں، بظاہر اب یہ تاریخ کا حصہ بن چکا ہے۔

۲- ظاہریہ

اس کلامی مکتب فکر کے بانی علامہ داؤد بن علیؒ (مولود: ۲۰۲ھ) ہیں، جو بڑے فقیہ تھے اور اس کی بھرپور ترجمانی ممتاز محدث وفقیہ علامہ ابن حزم اندلسیؒ (متوفی: ۴۵٦ھ) نے کی ہے، ظاہریہ یا اصحاب ظواہر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ قیاس کو دلیل شرعی تسلیم نہیں کرتے؛ یعنی بہر صورت نص کے ظاہری مفہوم ہی پر اکتفا کرتے ہیں؛ اسی لئے یہ حنابلہ سے

بھی بڑھ کر نصوص کے معنی میں تاویل کے مخالف ہیں، مثلاً: وہ اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ کو ثابت کرتے ہیں؛ لیکن چوں کہ قرآن وحدیث میں صفات کے الفاظ استعمال نہیں کئے گئے ہیں؛ اس لئے وہ اللہ تعالیٰ کے لئے صفات کی تعبیر کو غلط اور بدعت قرار دیتے ہیں، بہرحال اصحاب ظواہر اہل سنت والجماعت میں سے ہیں، وہ خود اپنے آپ کو اہل سنت میں سے قرار دیتے ہیں، اور فکری اعتبار سے حنابلہ سے قریب ہیں۔

۳- حنابلہ

امام احمد بن حنبلؒ علماء اہل سنت کی بلند پایہ شخصیت ہیں، وہ بڑے محدث بھی تھے اور فقیہ بھی، اور نصوص کے سلسلہ میں ان کا عمومی مزاج ظاہری الفاظ کو قبول کرنے کا تھا، یہی مزاج اسلامی اعتقادات سے متعلق نصوص کی تشریح وتوجیہ میں بھی انھوں نے اختیار کیا، اس حلقہ کی سب سے موثر ترجمانی علامہ ابن تیمیہؒ نے کی ہے؛ اس لئے جو لوگ نصوص میں تاویل سے کام لیتے ہیں، ان کی فکر اور امام احمد بن حنبلؒ اور ان کے متبعین کی فکر کے درمیان اختلاف پیدا ہوا، اس طرح یہ ایک مستقل اعتقادی مذہب بن گیا۔

(مستقل طور پر حنابلہ کا ذکر آئے گا، وہاں تفصیلات ذکر کی جائیں گی)

۴- اَشاعرہ

اس مکتب فکر کی بنیاد تیسری صدی کے اواخر میں امام ابوالحسن الاشعریؒ نے رکھی، جو پہلے فرقہ معتزلہ سے تعلق رکھتے تھے؛ لیکن بعد میں اس سے الگ ہو گئے، اور اہل سنت والجماعت میں علم کلام کا ایک مستقل مکتبِ فکر ان کے ذریعہ وجود میں آیا، مذہب اشعری اپنی ابتدائی دور ہی سے اہل سنت والجماعت کا مقبول ترین مذہب رہا ہے، اس میں بڑے بڑے فقہاء اور محدثین پیدا ہوئے ہیں اور یہ ایک حقیقت ہے کہ اشعری اور ماتریدی مکتب فکر اہل سنت والجماعت کے غالب ترین حصہ کا احاطہ کرتا ہے۔

(آئندہ مستقل طور پر اشاعرہ اور ان کے افکار کا ذکر آئے گا)

۵- ماتریدیہ

اس مکتبِ فکر کے مؤسس امام ابومنصور ماتریدیؒ (متوفی: ۳۳۳ھ) ہیں، خود امام ماتریدی، فقہی اور اعتقادی مسائل میں امام ابوحنیفہؒ کے متبع تھے؛ اسی لئے فطری طور پر احناف کے یہاں اس مذہب کو خصوصی مقبولیت حاصل ہوئی، ترکی اور افغانستان سے لے کر پورا برصغیر جہاں مسلمانوں کی سب سے بڑی آبادی واقع ہے، میں زیادہ تر اسی مسلک کی پیروی کرنے والے مسلمان ہیں۔

اشاعرہ اور ماتریدیہ کے درمیان بہت کم مسائل میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔

(آئندہ مستقل طور پر ماتریدیہ کے افکار پر گفتگو ہوگی)

تمرینی سوالات

(۱) علم کلام کی تدوین وارتقاء کتنے مراحل اور ادوار میں انجام پائی؟

(۲) گناہِ کبیرہ کے سلسلے میں خوارج، مرجئیہ اور اہل سنت کا کیا نقطۂ نظر ہے اور یہ بحث کس پس منظر میں شروع ہوئی؟

(۳) جبر و اختیار کے سلسلے میں اہل سنت والجماعت کا کیا نقطۂ نظر ہے اور قدریہ اور جبریہ کیا کہتے ہیں؟

(۴) مسئلہ امامت کے پیدا ہونے کا کیا سبب ہوا اور اس سلسلے میں شیعہ حضرات کا کیا نقطۂ نظر ہے؟

(۵) فرقۂ حشویہ کے کیا عقائد ہیں، کیا اب بھی یہ فرقہ باقی ہے؟

(۶) ظاہریہ نصوص کی تاویل کے بارے میں کیا نقطۂ نظر اختیار کرتے ہیں، مثال سے سمجھایئے؟

• • •

آسان علم کلام

تیسرا باب
چند فرقِ ضالہ

اب ہم ان کلامی مکاتب فکر کی طرف آتے ہیں، جن کے یہاں نصوص میں تاویل اور متبادر معنی کو چھوڑ کر غیر متبادر معنی مراد لینے کا طریقہ زیادہ اختیار کیا جاتا ہے، بنیادی طور سے یہ پانچ ہیں :

(۱) اسماعیلیہ۔
(۲) اثناعشریہ۔
(۳) معتزلہ۔
(۴) زیدیہ۔
(۵) خوارج۔

۱- اسماعیلیہ

اس فرقہ کا آغاز عباسی خلیفہ مامون الرشید کے زمانہ میں ہوا اور معتصم کے زمانہ میں ان کی فکر کی خوب اشاعت ہوئی، مامون کے زمانہ میں عبداللہ بن میمون قدّاح جو امام جعفر صادقؒ کا غلام تھا اور محمد بن حسین جو 'دَندان' سے معروف تھا، اور کچھ اور حضرات قید کئے گئے اور جیل ہی میں انھوں نے ایک نئے فرقہ کی بنیاد رکھی، پھر جب یہ جیل سے رہا ہوئے تو عوام میں اس مذہب کی اشاعت کی، اور یہ فرقہ اُس وقت اپنے عروج پر پہنچ گیا، جب مصر میں فاطمیوں کی حکومت قائم ہوگئی، جو اسی مذہب کے پیرو تھے، یہ حضرات اپنی نسبت اہل بیت کی طرف کرتے ہیں؛ لیکن ان میں بعض ایسے آباء واجداد کا ذکر کرتے ہیں، جو ان کے عقیدہ کے مطابق مستور ہیں، اور چوں کہ ان کے نزدیک آخری امام اسماعیل بن جعفر تھے؛ اس لئے یہ اسماعیلیہ کہلائے، اس فرقہ کو عام طور پر ''باطنیہ'' کے نام سے موسوم کیا گیا ہے؛ کیوں کہ ان کے بنیادی افکار میں یہ بات شامل ہے کہ ظاہرِ قرآن کا اعتبار نہیں؛ قرآن کا ایک باطن ہے اور اسی کا اعتبار ہے، اس کے علاوہ یہ تحریک اپنے طویل دور میں سینہ بسینہ خفیہ طور پر چلتی رہی ہے، شاید اس

وجہ سے بھی علماء اہل سنت والجماعت کے درمیان ان کے حق میں زیادہ تر 'باطنیہ' کی ہی تعبیر استعمال کی جاتی رہی ہے۔

یہ فرقہ ایمانیات کے بشمول قرآن مجید کی تمام ہی تعبیرات کا ایک الگ مفہوم متعین کرتا ہے، جو متبادر معنی سے بالکل مختلف ہے؛ اس کی چند مثالیں ذیل میں ذکر کی جاتی ہیں، جن کو علامہ سید شریفؒ نے ''شرح مواقف'' اور امام غزالیؒ نے ''فضائح الباطنیہ'' میں ذکر کیا ہے :

وضو : اس سے امام وقت کی حمایت ونصرت مراد ہے۔

صلوٰۃ : اس سے رسول کی ذات مراد ہے؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ''إِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْہٰی عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْکَر'' (عنکبوت: ۴۵) اور رسول ہی فحش ومنکر سے روکتا ہے۔

زکوٰۃ : دین کے علم کے ذریعہ نفس کا تزکیہ۔

صوم : امام کے راز کو کھولنے سے بچنا۔

حج : امام کی زیارت۔

زنا : امام کے راز کو کھول دینا۔

کعبہ : رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

باب : حضرت علیؓ۔

صفا : رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

مروہ : حضرت علیؓ۔

تلبیہ : امام کی دعوت کو قبول کرنا۔

سات بار طواف بیت اللہ : ائمہ سبعہ سے موالات وتعلق۔

(ائمہ سبعہ سے حضرت علیؓ، حضرت حسن بن علیؓ، حضرت حسین بن علیؓ، امام علی بن حسین بن زین العابدینؒ، امام محمد باقرؒ، امام جعفر صادقؒ اور اسماعیل بن جعفرؒ مراد ہیں)۔

جنت : دنیا میں ملنے والی آسانی وراحت۔

دوزخ : جسم کو پہنچنے والی تکلیف اور مشقت۔

جنت میں دُودھ کی نہریں : علم باطن کے چشمے۔

جنت میں شراب کی نہریں : علم ظاہر۔

شہد کی نہریں : وہ علم باطن جو ائمہ سے ماخوذ ہو۔

اسی طرح یہ معجزات اور مافوق الطبع چیزوں کی بھی تاویل کرتے ہیں، چند مثالیں ذکر کی جاتی ہیں :

ملائکہ : وہ لوگ جو اس فرقہ کے امام کی طرف لوگوں کو دعوت دیں۔

شیاطین : وہ لوگ جو اس فرقہ کے مخالفین ہیں۔

واقعہ نوح میں طوفان : اس سے طوفانِ علم مراد ہے اور ڈوبنے والوں سے مراد وہ لوگ ہیں جو حدیث وسنت پر عمل کرتے ہیں۔

سفینہ : اس فرقہ کا خصوصی حلقہ، جس نے امام کی دعوت کو قبول کیا ہو۔

نارابراہیم : نمرود کا غصہ، نہ کہ حقیقی آگ۔

ذبح اسحاق : حضرت اسحاق علیہ السلام سے عہد لینا۔

عصائے موسیٰ : لکڑی کا عصا نہیں؛ بلکہ وہ علمی حجت مراد ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دی گئی۔

سمندر کا پھٹ جانا : سمندر سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام کا علم اور پھٹ جانے سے مراد آپ کے علم کی اشاعت۔

من وسلوی : وہ علم جو داعی حق پر آسمان سے اُترتا ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ۔

احیائے موتی : جہالت کی موت سے علم کی زندگی کا حاصل ہونا۔

اندھا کو بینا بنانا : گمراہی کے اندھاپن سے باہر لانا۔

ابرص کو صحت دینا : کفر کے برص سے نکال کر ایمان کی صحت کی طرف لانا۔

ابلیس : حضرت ابوبکرؓ (نعوذ باللہ)۔

آدم : حضرت علیؓ۔

دجال : حضرت ابوبکرؓ (نعوذ باللہ)۔

یاجوج وماجوج : ظاہر شریعت پر عمل کرنے والے۔

غرض کہ باطنیہ نہ صرف اعتقادات بلکہ عبادات کی بھی ایسی تاویل کرتے ہیں کہ انسان شرعی واجبات سے فارغ ہوجائے، اور اس کو کسی ماورائے عقل بات، جیسے: معجزات، جنت ودوزخ وغیرہ کو ماننا نہ پڑے۔

اس فرقہ کے بارے میں اہل علم کا تاثر یہی ہے کہ اس میں بہت سے وہ لوگ شامل ہوگئے تھے، جو مجوسی تھے اور جو بظاہر مسلمان ہوگئے تھے؛ لیکن پہلے سے وہ جن افکار کو قبول کئے ہوئے تھے، پوری طرح ان سے باہر نہیں آئے، انھوں نے دین میں تشکیک پیدا کرنے اور شبہات اُبھارنے کی مہم چلائی، نہ صرف عقائد میں بلکہ احکام فقہیہ میں بھی، مثلاً یہ کہ فجر کی فرض نماز دو، ظہر کی چار، مغرب کی تین اور عشاء کی چار ہی کیوں رکھی گئی؟ وضو میں چار عضو کے دھونے اور تیمم میں دو ہی عضو کے دھونے کا حکم کیوں دیا گیا؟ وغیر ذلک۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ حالات اور مصالح کے تحت باطنیہ کے افکار اور ان کے طریقہ کار میں تبدیلیاں آتی رہی ہیں؛ لیکن تین باتیں ان کے مذہب میں فکری اساس کا درجہ رکھتی ہیں :

(۱) نظریہ تعلیم: اس کا خلاصہ یہ ہے کہ انسانی عقل قابل اعتماد نہیں، وہ خطا اور صواب دونوں کا احتمال رکھتی ہے اور دین کی بنیاد کسی ایسے ذریعہ پر نہیں رکھی جاسکتی جو یقینی نہ ہو؛ اس لئے اللہ تعالیٰ کی معرفت اور دین کو سمجھنے کے لئے علم کا ایک یقینی ذریعہ تسلیم کرنا ہوگا اور وہ ذریعہ ہے فرقہ اسماعیلیہ کا امام، جو معلم معصوم ہے، اس کے جو علوم اس کے متبعین تک پہنچیں، خواہ براہ راست امام سے، یا اس کے داعیوں سے، وہی علم معتبر ہے اور اس کی حیثیت علم قطعی کی ہے؛ کیوں کہ امام معصوم ہے، غلطی کا مرتکب نہیں ہوتا۔

(۲) نظریہ توحید: اسماعیلیوں کے نزدیک توحید سے مراد ہے اللہ تعالیٰ کا تمام صفات

سے پاک ہونا، جیسے نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اللہ موجود ہے اور نہ یہ کہ اللہ غیر موجود ہے، نہ یہ کہ اللہ عالم ہے اور نہ یہ کہ اللہ جاہل ہے، نہ اللہ کو قادر کہا جا سکتا ہے اور نہ عاجز، یعنی ان کے خیال کے مطابق اللہ تعالیٰ کی ذات تمام صفات سے پاک اور منزہ ہے، غرض کہ وہ اللہ کی ذات کو 'معطل' مانتے ہیں، کہا جاتا ہے کہ ان کا یہ تصور دراصل یونانی فلسفی افلاطون کی فکر سے ماخوذ ہے۔

(۳) نظریہ مثل: اسماعیلی حضرات عالَم غیب کو 'حدود علویہ' کہتے ہیں اور عالَم شہادت کو 'حدود سفلیہ' ان کا نظریہ ہے کہ عالم شہادت میں جو چیزیں پائی جاتی ہیں، ان کا ایک مثیل عالم غیب میں ہے، اسی نظریہ کے تحت انھوں نے اسلامی اصطلاحات وغیرہ کی بے جا تاویل کی ہے، جیسا کہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت علیؓ وغیرہ کے بارے میں ذکر آچکا ہے۔

۲- اثنا عشریہ

اگرچہ شیعوں کے بہت سے فرقے ہیں اور شیخ عبدالقادر بغدادیؒ (متوفی:۴۲۹ھ) نے اپنی کتاب ''الفرق بین الفرق'' میں پندرہ فرقوں کا ذکر کیا ہے، جن میں بعض وہ بھی ہیں جو حضرت علیؓ کو خدا کا درجہ دیتے ہیں، اور ان کے اندر خدائی صفات پائے جانے کے قائل ہیں، اور بعض وہ بھی ہیں جو اہل سنت والجماعت سے قریب ہیں اور صحابہ پر سب وشتم کے قائل نہیں؛ لیکن اہل تشیع میں جس فرقہ کو سب سے زیادہ قبول حاصل ہوا اور جو آج بھی ایران وعراق اور دنیا کے اکثر ملکوں میں شیعہ کے نام سے جانا جاتا ہے، وہ 'اثنا عشری' ہے، ان کو 'امامیہ' بھی کہا جاتا ہے؛ کیوں کہ ان کے یہاں عقیدہ امامت کو دین میں مرکزی حیثیت حاصل ہے، اور ان کو اثنا عشری اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ بارہ ائمہ کے قائل ہیں، اہل سنت بھی ان ائمہ کو اپنے سلف صالحین میں شمار کرتے ہیں، مگر امام معصوم نہیں مانتے، ان کے نام اس طرح ہیں:

۱- حضرت علی بن ابوطالبؓ ملقب بہ: مرتضیٰ (متوفی:۴۰ھ)۔

۲- حضرت حسن بن علیؓ، ملقب بہ: مجتبیٰ (متوفی:۴۹ھ)۔

۳- حضرت حسین بن علیؓ، ملقب بہ: شہید (جو یزید کے دور حکومت میں شہید ہوئے)۔

۴- حضرت علی زین العابدین بن حسینؒ، ملقب بہ: سجاد (متوفی:۹۵ھ)۔

۵- امام محمد بن علی بن زین العابدین، ملقب بہ: باقرؒ (متوفی: ۱۱۴ھ)۔

۶- امام جعفر بن محمد بن علی، ملقب بہ: صادقؒ (متوفی: ۱۴۸ھ)

۷- امام موسی بن جعفر، ملقب بہ: کاظمؒ (متوفی: ۱۸۳ھ)۔

۸- امام علی بن موسی، ملقب بہ: رضاؒ (متوفی: ۲۰۳ھ)۔

۹- امام محمد جواد، ملقب بہ: تقیؒ (متوفی: ۲۲۰ھ)۔

۱۰- امام علی ہادی بن محمد، ملقب بہ: نقیؒ (متوفی: ۲۵۴ھ)۔

۱۱- امام ابو محمد حسن عسکری، ملقب بہ: ذکیؒ (متوفی: ۲۶۰ھ)۔

۱۲- امام محمد مہدی، ملقب بہ: حجت — ان کو ''مہدی منتظر'' بھی کہا جاتا ہے، جو شیعہ عقیدہ کے مطابق سامرہ کے غار میں روپوش ہیں، اور قربِ قیامت میں ظاہر ہوں گے اور روئے زمین کو عدل وانصاف سے بھر دیں گے، مہدی منتظر کب چھپ گئے؟ اس سلسلہ میں ایک قول یہ ہے کہ اس وقت ان کی عمر چار سال کی تھی اور ایک قول کے مطابق آٹھ سال۔

اثنا عشری حضرات کے بنیادی عقائد یہ ہیں :

(۱) ایمان کی بنیاد تین چیزیں ہیں: ذات وصفات کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کے ایک ہونے اور اپنے تمام افعال میں عادل ہونے کا اقرار، دوسرے: انبیاء کی نبوت کی تصدیق، تیسرے: ائمہ معصومین کی امامت کی تصدیق، ان سے تعلق کا اظہار، ان کے دشمنوں سے براءت اور ان میں سے آخری امام محمد مہدی کا انتظار۔

(۲) ولایت ارکان دین میں سب سے افضل رکن ہے، نماز، روزہ، حج کے ترک کرنے کی وجہ سے تو آدمی کافر نہیں ہوگا؛ لیکن ولایت میں کوئی رخصت نہیں، اگر کوئی شخص اس کا اقرار نہ کرتا ہو تو وہ کافر ہے۔

(۳) امامت ایک امر منصوص ہے اور اس کی تعیین نص سے ہوئی ہے اور رسول اللہ ﷺ کے بعد سیدنا حضرت علیؓ کو امام مقرر کیا گیا ہے۔

(۴) حضرت ابوبکر وعمر وعثمان رضی اللہ عنہم نے حضرت علیؓ پر ظلم کیا اور انھوں نے ان کے حق امامت کو غصب کیا ہے۔

(۵) اثنا عشریہ کے نزدیک امام غیر معمولی اختیارات، فضائل اور صلاحیتوں کا مالک ہوتا ہے، جن میں سے چند یہ ہیں :

۱- امام کو ہر چیز کا علم ہے، وہ ماضی، حاضر، مستقبل، غائب اور موجود، ہر چیز کا علم رکھتا ہے، ان کا علم کامل ہے۔

۲- اس کو ایک باطنی علم حاصل ہوتا ہے، جو دوسرے لوگوں کو حاصل نہیں ہوتا، یہ علم رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ حضرت علیؓ کو حاصل ہوا، اور حضرت علیؓ کے بعد تمام ائمہ معصومین کو حاصل ہوا۔

حضرت علیؓ کو جو خصوصی علم حاصل ہوا، وہ بنیادی طور پر تین کتابوں کی شکل میں ائمہ کے پاس موجود تھا، جو وراثتاً ہر امام کو پہلے امام سے حاصل ہوا کرتا تھا، ایک: 'الجامعہ' جس کی لمبائی ستر ہاتھ ہے، جو رسول اللہ ﷺ نے املاء کرایا اور حضرت علیؓ نے تحریر کیا، اس میں حلال وحرام کے تمام احکام موجود ہیں اور ائمہ معصومین اسی کے مطابق عمل کرتے تھے اور لوگوں کی رہنمائی کرتے تھے، دوسرے: 'کتاب الجفر' یہ بھی آپ نے حضرت علیؓ کو املاء کرایا، اس میں ایک حصہ ''جفرا بیض'' کا ہے، جس میں انبیاء کے علوم اور بنو اسرائیل کے صحائف وغیرہ ہیں، اور دوسرا حصہ 'جفر احمر' کا ہے، جس میں جنگوں، اور ہلاکت خیز حوادث کا ذکر ہے، جس کو صرف جنگ کے موقع پر کھولنے کی اجازت ہے؛ چنانچہ مہدی منتظر اس کتاب کو کھولیں گے، تیسرے: 'مصحف فاطمہؓ' جس میں وہ باتیں ہیں جو حضرت جبرئیل علیہ السلام نے حضرت فاطمۃ الزہراؓ کو اس وقت بتائیں، جب حضور ﷺ کی وفات کے بعد تعزیت کے لئے آئے تھے، اس میں ان حالات کا بھی ذکر ہے جو حضرت فاطمہؓ کی نسل کو آئندہ پیش آئیں گے، یہ بھی حضرت علیؓ کے قلم سے ہے۔

۳- امام پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے الہام ہوا کرتا ہے اور بعضوں کے نزدیک وحی بھی، نیز امام کے ہاتھوں پر معجزات بھی ظاہر ہوسکتے ہیں۔

۴- امام چوں کہ رسول اللہ ﷺ کا قائم مقام ہے؛ اس لئے وہ ہر طرح کے ظاہری وباطنی گناہ سے محفوظ ہوتا ہے، بچپن سے لے کر موت تک عمداً یا سہواً اس سے کوئی غلطی نہیں ہوسکتی۔

۵- عام انسان جس مٹی سے پیدا کئے گئے ہیں، امام کی پیدائش اس مٹی سے نہیں ہوئی؛

بلکہ الگ مٹی سے ہوئی ہے، وہ مٹی عرش کے نیچے بنائی گئی ہے، اس قول کو اثنا عشری کتابوں میں امام جعفر صادقؒ کی طرف منسوب کیا گیا ہے، اس طرح کا عقیدہ یہودیوں کے بھی یہاں پایا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو الگ مٹی سے بنایا ہے اور دوسرے انسانوں کو الگ مٹی سے۔

یہ بات ظاہر ہے کہ مسئلہ امامت وغیرہ میں اثنا عشری حضرات کا جو تصور ہے، ان کا قرآن وحدیث کے ظاہری الفاظ سے ثابت کرنا ممکن نہیں؛ اس لئے ان کے یہاں بھی نصوص کے متبادر معنی سے انحراف کی صورت بکثرت پائی جاتی ہے، ان کے یہاں بھی قرآن مجید کے ہر لفظ کا ایک باطنی مفہوم بھی ہے اور یہ ضروری ہے کہ ظاہر و باطن دونوں پر ایمان لایا جائے، علم ظاہر کا ذریعہ تو نصوص کے الفاظ ہیں اور علم باطن کا ذریعہ اہل بیت اور ائمہ معصومین ہیں، وہ اسماعیلیوں کی طرح ظاہری معنی کا انکار تو نہیں کرتے؛ لیکن ظاہری معنی کے ساتھ ساتھ بہت سے مواقع پر اس کا ایک باطنی معنی بھی متعین کرتے ہیں، جیسے اہل جنت کے لئے جو پانی، دُودھ، شراب، اور شہد کی نہروں کا ذکر کیا گیا ہے، وہ اس کو تسلیم کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس کی ایک اور مراد بھی ہے، اور وہ یہ کہ اس سے ائمہ معصومین کے علوم مراد ہیں اور دونوں معنوں کے درمیان وجہ اشتراک یہ ہے کہ جیسے پانی اور دُودھ وغیرہ انسان کے لئے نفع بخش ہے، اسی طرح ائمہ کے علوم بھی انسان کے لئے نافع ہیں۔

یہاں ان کی تاویل کی چند مثالیں ذکر کی جاتی ہیں :

☆ سورہ انشقاق آیت نمبر: ۱۹ میں فرمایا گیا ہے: ''لَتَرْكَبُنَّ طَبَقاً عَنْ طَبَق'' یعنی تمہیں ایک حالت کے بعد دوسری حالت سے گزرنا ہے، ان حضرات کا خیال ہے کہ اس سے اُمتِ محمد یہ مراد ہے کہ گذشتہ اُمتوں کی طرح یہ اُمت انبیاء کے بعد ان کے وصیوں کے ساتھ یعنی ائمہ معصومین کے ساتھ غدر اور دھوکہ کا معاملہ کر رہی ہے۔

☆ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ'' (یونس: ۱۵) —— اثنا عشری حضرات کے نزدیک ''بَدِّلْہ'' میں حضرت علیؓ کی جانب اشارہ ہے، یعنی آخرت کا خوف نہ رکھنے والے لوگ مطالبہ کرتے ہیں کہ حضرت علیؓ کے حق میں وصیت کو بدل دیں۔

☆ ''قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَ مَا بَطَنَ''(اعراف:۳۳) —— اثنا عشری حضرات کہتے ہیں کہ اس میں کھلے ہوئے گناہوں سے وہ گناہ مراد ہیں جن کا قرآن مجید میں ذکر ہے اور چھپے ہوئے گناہوں سے ''ائمہ جور'' مراد ہیں۔

☆ ''الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ''(البقرہ:۳)—— اثنا عشری حضرات کہتے ہیں کہ غیب پر ایمان لانے میں امام غائب پر ایمان لانا شامل ہے۔

محققین کی رائے ہے کہ اثنا عشری علم کلام میں ایک حد تک معتزلہ سے بھی تاثر پایا جاتا ہے، جیسے معتزلہ آخرت میں بھی اللہ تعالیٰ کی رویت کو ناممکن سمجھتے ہیں اور رویت سے متعلق آیات واحادیث کی تاویل کرتے ہیں، علامہ قمی نے بھی ''وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ، اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ''(قیامہ:۲۲-۲۳) میں اللہ کی طرف دیکھنے سے اللہ کی نعمتوں کی طرف دیکھنا مراد لیا ہے نہ کہ اللہ تعالیٰ کا دیدار؛ اسی لئے بعض اہل علم کا خیال ہے کہ شیعہ متکلم سید شریف مرتضیٰ جو قاضی عبد الجبار معتزلی کے شاگرد تھے، ان کے ذریعہ معتزلہ کے بعض افکار اثنا عشری عقائد کا حصہ بن گئے۔

تمرینی سوالات

(۱) جن مکاتبِ فکر نے نصوص کے متبادر معنی کو چھوڑ کر غیر متبادر معنی مراد لینے میں غلو کیا ہے، ان کے نام بتایئے؟

(۲) فرقۂ اسماعیلیہ کی بنیاد کس طرح پڑی اور ان کو باطنیہ کیوں کہا جاتا ہے؟

(۳) اسماعیلیوں کی بے جا تاویلات کی چند مثالیں پیش کیجئے؟

(۴) قرآن مجید کی درج ذیل تعبیرات کا یہ کیا مطلب بیان کرتے ہیں؟ زکوٰۃ، تلبیہ، سفینۂ نوح، عصاءِ موسیٰ، من وسلویٰ، یاجوج وماجوج۔

(۵) اسماعیلیہ کے نزدیک نظریۂ توحید اور نظریۂ مثل سے کیا مراد ہے؟

(۶) شیعوں کے سب سے بڑے فرقے کو اثناء عشریہ یا امامیہ کیوں کہا جاتا ہے؟

(۷) فرقۂ اثناء عشریہ کے بارہ ائمہ کون کون حضرات ہیں؟

(۸) ان کے یہاں ایمان کی بنیاد کن تین چیزوں پر ہے؟

(۹) شیعہ مذہب میں ولایت کا کیا مقام ہے؟

(۱۰) شیعہ حضرات کے نزدیک امامت منصوص ہے یا مسلمانوں کے اختیار وانتخاب پر مبنی ہے؟

(۱۱) اثناء عشریہ کے نزدیک امام عام مسلمانوں کے مقابلے جو خصوصیات حاصل ہیں، ان میں سے چند کا ذکر کیجئے؟

(۱۲) ان کے عقیدہ کے مطابق حضرت علیؓ کو ایک باطنی علم حاصل تھا، یہ علم کن کتابوں کی شکل میں ان کے ائمہ کے پاس موجود تھا؟

(۱۳) ''اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ'' سے ان کے نزدیک کیا مراد ہے؟

۳- معتزلہ

معتزلہ قدیم کلامی فرقوں میں سے ایک ہے، جس کو عباسی دور میں بڑا عروج حاصل ہوا، اس مذہب میں بڑے بڑے اہل علم بھی پیدا ہوئے ہیں، امامت کے مسئلہ میں ان کا نقطہ نظر وہی ہے، جو اہل سنت والجماعت کا ہے، عقائد کی تشریح اور قرآن مجید کی توضیح میں ان کے یہاں بھی عقل ورائے کو خاص اہمیت دی گئی ہے اور اس کے لئے نصوص کے متبادل الفاظ میں تاویل سے کام لیا گیا ہے؛ لیکن اس قدر بھی نہیں جتنا کہ اسماعیلیوں اور اثنا عشریوں نے کیا ہے، اس کلامی مذہب کی بنیاد واصل بن عطاء (مولود: ۸۰ھ، متوفی: ۱۳۱ھ) اور اس کے ساتھی عمرو بن عبید نے رکھی ہے، نقل کیا جاتا ہے کہ امام حسن بصریؒ کے پاس ایک صاحب آئے اور کہا کہ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب کافر ہو جاتا ہے، جیسا کہ خوارج کا مذہب ہے، اور کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اگر آدمی ایمان رکھتا ہو تو معصیت سے کوئی نقصان نہیں، یہ مرجیۂ کا مذہب ہے، اس سلسلہ میں آپ کوئی فیصلہ کن بات فرما دیجئے، حسن بصریؒ غور کرنے لگے، واصل بن عطاء، جو ان کے تلامذہ میں سے تھا، وہ مجلس میں موجود تھا، اس نے کہا: میں کہتا ہوں کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب نہ کافر ہے اور نہ مسلمان؛ بلکہ ان دونوں کے درمیان کے درجہ میں ہے، حسن بصریؒ اس کا

جواب سن کر خفا ہوئے اور فرمایا: تم میری مجلس سے چلے جاؤ، ''اعتزل عنا''؛ چنانچہ واصل اور ان کے ساتھ عمرو بن عبید مجلس سے نکل گئے، اسی لئے اہل سنت اس گروہ کو ''معتزلہ'' کہنے لگے۔

معتزلہ چوں کہ انسان کے افعال کے بارے میں یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ اعمال خود اس کی قدرت اور طاقت سے صادر ہوتے ہیں؛ اس لئے اہل سنت کی کتابوں میں بہ کثرت ان کا قدریہ کے لفظ سے بھی ذکر کیا جاتا ہے؛ لیکن خود معتزلہ اپنے آپ کو ''اصحاب العدل والتوحید'' کہتے ہیں؛ کیوں کہ ان کے اُصولِ خمسہ میں عدل اور توحید بھی شامل ہے، بعد کو یہ فرقہ کئی فرقوں میں بٹ گیا، شیخ عبد القادر بغدادیؒ نے ان کے بیس فرقے ذکر کئے ہیں، معتزلہ کو ایک زمانہ میں بہت قبولیت حاصل ہوگئی تھی؛ کیوں کہ بنواُمیہ میں سے یزید بن ولید اور مروان بن محمد نے ان کے نقطہ نظر کو اختیار کرلیا تھا اور عباسی خلفاء بھی ان سے متاثر رہے، اور بالخصوص مامون الرشید نے ایک معتزلی عالم احمد بن ابی داؤد سے متاثر ہوکر پوری طرح سے فکر اعتزال کو قبول کرلیا تھا، یہ ان کا دور عروج تھا، مامون نے بہ قوت اس فکر کو پورے ملک میں نافذ کرنا چاہا، یہاں تک کہ اس فکر کی مخالفت کرنے والوں کو سخت سزائیں دی گئیں، امام احمد بن حنبلؒ اور بعض دیگر علماء اہل سنت کو بڑی ابتلاء سے دوچار ہونا پڑا، پھر جب متوکل برسر اقتدار آیا تو اس نے معتزلہ کے خلق قرآن کے عقیدہ کے لزوم کو ختم کیا اور اس سے اختلاف کرنے والوں کو سزائیں دینے کے لئے جو عدالتیں قائم تھیں، ان کو بھی معطل کردیا۔

پانچ بنیادی عقائد

عقائد کے سلسلہ میں معتزلہ کا مسلک پانچ بنیادی اُصولوں پر قائم ہے، جن پر ان کے تمام فرقے متفق ہیں۔

(۱) توحید۔

(۲) عدل۔

(۳) وعدہ و وعید۔

(۴) ایمان و کفر کے دو درجوں کے درمیان ایک اور درجہ۔

(۵) امر بالمعروف و نہی عن المنکر۔

توحید

اس سے مراد یہ ہے کہ تنہا اللہ تعالیٰ کی ذات کو ازلی اور قدیم تسلیم کیا جائے، اسی لئے وہ اللہ تعالیٰ کی صفات، علم، قدرت، ارادہ، حیات، اور سمع و بصر وغیرہ کے قائل نہیں ہیں، ان کا خیال ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی ان صفات کو مانا جائے تو اللہ تعالیٰ کی ذات کے علاوہ ان کا بھی قدیم اور ازلی ہونا لازم آئے گا، اور یہ عقیدۂ توحید کے منافی ہے، اللہ تعالیٰ کی صفات ہی میں سے ایک صفت کلام بھی ہے اور جب قرآن مجید اللہ کا کلام ہے تو اگر اس کو ازلی مانا جائے تو یہ بھی اللہ تعالیٰ کی توحید کے منافی ہے؛ اس لئے ان کے نزدیک قرآن مجید ازلی کلام نہیں؛ بلکہ 'مخلوق' ہے، یعنی پہلے نہیں تھا، اللہ نے اس کو پیدا فرمایا، خلق قرآن کے مخلوق اور غیر مخلوق ہونے کے مسئلہ نے عباسی دور میں معتزلہ اور اہل سنت کے درمیان سخت معرکے کی صورت اختیار کرلی اور قرآن کو مخلوق نہ ماننے کی وجہ سے امام احمدؒ وغیرہ کو ابتلاء اور آزمائش سے گزرنا پڑا؛ البتہ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ معتزلہ یہ کہتے ہوں کہ اللہ کو علم نہیں، قدرت نہیں ہے، وغیرہ؛ بلکہ ان کے نزدیک یہ سب باتیں ذات باری تعالیٰ کا حصہ ہیں، یہ عین ذات ہیں، یہ الگ سے صفت نہیں ہے۔

اسی بنیاد پر قرآن و حدیث میں جہاں جہاں اللہ تعالیٰ کی صفات بیان کی گئی ہیں، معتزلہ ان میں تاویل کرتے ہیں، مثلاً :

☆ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا'' (نساء:۱۶۴) اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے گفتگو کی، اس سے اللہ تعالیٰ کی صفت کلام ثابت ہوتی ہے، معتزلہ نے اس کی دور از کار تاویل کی ہے کہ یہ لفظ 'کَلْم' سے ماخوذ ہے، جس کے معنی زخم کے آتے ہیں، اور اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو رنج و محن کے ناخنوں اور فتنوں کے پنجوں سے زخمی کردیا۔

☆ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ'' (بقرہ:۲۵۵) یعنی اس کی کرسی نے آسمان و زمین کا احاطہ کر رکھا ہے، اس سے اللہ تعالیٰ کی کرسی پر مستوی

ہونے کی صفت معلوم ہوئی ، معتزلہ نے کہا کرسی سے مراد علم ہے ، یعنی اللہ تعالیٰ کے علم نے آسمان وزمین کو گھیر رکھا ہے۔

☆ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا '' (نساء:۱۲۵) کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دوست بنالیا......، معتزلہ نے کہا کہ خلیل یہاں 'خ' کے زبر کے ساتھ ''خلۃ'' بہ معنی حاجت سے ماخوذ ہے، اس لحاظ سے خلیل کے معنی ''فقیر ومحتاج'' کے ہوئے، پس مراد یہ ہے کہ اللہ نے ابراہیم کو اپنی رحمت کا محتاج رکھا۔

☆ اسی بنیاد پر معتزلہ رویت باری کے قائل نہیں ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ، اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ'' (قیامہ:۲۲-۲۳) اور دوسری جگہ ہے: ''عَلَى الْاَرَآئِكِ يَنْظُرُوْنَ'' (مطففین:۲۳) ان دونوں آیتوں میں اہل جنت کے اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کا ذکر آیا ہے، معتزلہ نے کہا کہ یہاں دیکھنے سے اللہ تعالیٰ کو دیکھنا مراد نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کے انعامات کو دیکھنا مراد ہے۔

عدل

عدل سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تمام احکام عدل پر مبنی ہیں؛ اس لئے وہ سب کے سب حسن ہیں نہ کہ قبیح؛ لہٰذا انسان جو قبیح کام کرتا ہے اور گناہ کا مرتکب ہوتا ہے، اس میں اللہ تعالیٰ کی قدرت وعمل کا کوئی دخل نہیں؛ بلکہ انسان کے افعال خود اس کی قدرت سے وجود میں آتے ہیں، اللہ کو اس کا علم تو ہے؛ لیکن وہ اس کا خالق نہیں ہے، بندے خود ان کے خالق ہیں؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ فساد کو پسند نہیں کرتے: ''وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ'' (بقرہ:۲۰۵) اور اللہ ظلم نہیں کرتے ''مَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ'' (غافر:۳۱) اگر اللہ تعالیٰ کو بندوں کے ان افعال کا خالق مانا جائے اور یہ مانا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے ہی اس کو گناہ کرنے یا نیکی کے نہ کرنے کی قدرت دی ہے تو یہ اللہ کی طرف ظلم وفساد کی نسبت ہوگی اور عدل کے خلاف بات ہوگی۔

اسی سے بعض اور تصورات بھی معتزلہ کے یہاں پیدا ہوئے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چیزوں کے اندر ذاتی طور پر حسن وقبح رکھا ہے اور عقل کی صورت میں انسان کے

اندر یہ صلاحیت دی ہے کہ وہ ان کا ادراک کر سکے؛ لہٰذا اگر کوئی شخص عقل کے تقاضا کے مطابق عمل کرتا ہے تو وہ لائق مدح وثواب ہے، اور کوئی اس کے تقاضے پر عمل نہیں کرتا تو لائق ملامت وعقاب ہے؛ کیوں کہ عدل کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کو ایسی صلاحیت عطا کر دے کہ وہ نص شارع کے بغیر بھی اچھے اور بُرے عمل کا ادراک کر سکے، اسی لئے معتزلہ کے یہاں اشیاء واعمال کے بہتر ہونے اور نہ ہونے (حَسَن وقبیح) کا مدار نص پر نہیں ہے۔

اسی تصور عدل سے ایک اور تصور پیدا ہوا کہ اللہ تعالیٰ پر 'اختیارِ اَصلح' واجب ہے، یعنی اللہ پر یہ بات لازم ہے کہ وہ وہی حکم دے، جو انسان کے لئے مفید ہو، اور ان ہی باتوں سے منع کرے، جو انسان کے لئے ضرر وفساد کا باعث ہوں، عدل کے اسی تصور کے تحت انھوں نے آیات قرآنی میں ان مقامات پر تاویل کی ہے، جہاں ان کے خیال کے مطابق اللہ تعالیٰ کی طرف ظلم کی نسبت ہوتی ہے، جیسے :

☆ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ''وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِيْنَ'' (فرقان:۳۱) ہم نے ہر نبی کے لئے مجرموں میں سے دشمن پیدا کئے، معتزلہ نے کہا کہا یہاں ''جَعَلْنَا'' کے معنی پیدا کرنے کے نہیں؛ بلکہ بتانے کے ہیں، یعنی ہم نے ہر نبی کو مجرمین میں سے اس کے دشمنوں کے بارے میں بتا دیا ہے۔

☆ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ'' (اعراف:۱۷۹) ہم نے دوزخ کے لئے بہت سے جنات اور انسان پیدا کئے ہیں، معتزلہ کہتے ہیں کہ یہاں معنی پیدا کرنے کے نہیں، ڈالنے کے ہیں، یعنی ہم نے بہت سے جنات وانسان کو دوزخ میں ڈال دیا ہے۔

عام طور پر معتزلہ نے اسی طرح کی تاویلات کی ہیں۔

وعدہ ووعید

وعدہ سے مراد قرآن مجید کی وہ آیتیں ہیں، جن میں اللہ تعالیٰ نے اعمالِ صالحہ پر جنت اور اجر وثواب کا وعدہ فرمایا ہے، اور وعید سے مراد وہ آیات ہیں، جن میں گناہوں پر دوزخ

اور عذاب کا وعدہ کیا گیا ہے، معتزلہ کے نزدیک اللہ تعالیٰ پر وعدہ و وعید کا پورا کرنا واجب ہے، اللہ پر یہ لازم ہے کہ جو لوگ اس کی اطاعت وفرمانبرداری کریں، ان کو جنت عطا کریں، اور جو لوگ کفر یا گناہ کے مرتکب ہوں، انھیں دوزخ میں رکھیں؛ البتہ کفار کو زیادہ سخت عذاب ہوگا اور گنہگاروں کو اس سے کم؛ اسی لئے نہ کافروں کی شفاعت ہوگی اور نہ گناہ کبیرہ کے مرتکبین کی۔

منزلہ بین المنزلتین

یعنی دو درجوں کے درمیان ایک اور درجہ، اس مسئلہ کا تعلق اصل میں گناہ کبیرہ کے مرتکب سے ہے، معتزلہ کا خیال ہے کہ گناہ کبیرہ کے ارتکاب کی وجہ سے انسان دائرہ ایمان سے باہر نکل جاتا ہے؛ البتہ جب تک وہ کفر وشرک کا مرتکب نہ ہو، کافر بھی نہیں ہوتا؛ اس لئے مومن و کافر کے درمیان ایک اور درجہ ہے اور وہ درجہ ہے گناہ کبیرہ کے مرتکبین کا؛ البتہ اگر ایسے گناہ گار لوگ توبہ کرلیں تو پھر ایمان کی طرف ان کی واپسی ہوجاتی ہے۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر

معتزلہ کے نزدیک معروف وہ ہے جس کا بہتر ہونا انسان کو سمجھ میں آجائے، اور منکر وہ ہے جس کا برا ہونا انسان کی سمجھ میں آجائے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو معتزلہ بھی 'فرض کفایہ' کہتے ہیں اور اہل سنت والجماعت بھی، نیز بنیادی طور پر اس مسئلہ کا تعلق عمل سے ہے نہ کہ عقیدہ سے؛ لیکن معتزلہ نے اس کو اتنی اہمیت دی کہ اس کو اپنے عقیدہ کا حصہ بنالیا؛ البتہ بعض نکات میں معتزلہ کا نقطۂ نظر اہل سنت سے مختلف ہے، جیسے ظالم حکمراں کے خلاف بغاوت کرنا معتزلہ کے نزدیک واجب ہے، اور اپنے مخالفین کے خلاف ہتھیار اُٹھانا واجب ہے؛ چاہے وہ غیر مسلم ہوں، یا گناہ کبیرہ کے مرتکب مسلمان ہوں، تاہم بتدریج معتزلہ میں اعتدال پسندی کے رجحان کو فروغ حاصل ہوا اور انھوں نے حکومتوں کے ساتھ دوستانہ اور مصالحانہ رویہ اختیار کرنے کو ترجیح دی، اسی طرح عباسی دور میں انھیں سیاسی اثر ورُسوخ حاصل ہوا۔

۴- زیدیہ

عالم اسلام میں شیعوں کے جو تین بڑے فرقے پائے جاتے ہیں، ان میں اثنا عشریہ

اور اسماعیلیہ کے علاوہ ''زیدیہ'' ہیں، یہ اپنی نسبت حضرت حسین بن علیؓ کے پوتے زید بن علیؒ کی طرف کرتے ہیں، وہ ایک بڑے مفکر، صاحبِ نظر عالم، عالی ہمت مجاہد اور داعی تھے، امام ابوحنیفہؒ نے حکومت کے خلاف جہاد میں ان کی مدد فرمائی تھی۔

موجودہ دور میں یمن میں غالب آبادی اسی زیدیہ مذہب کی ہے، اگرچہ ان کا شمار شیعہ فرقوں میں کیا جاتا ہے؛ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ بعض افکار میں اہل سنت سے اور بعض میں معتزلہ سے قریب ہیں، عدل وتوحید کے اُصول میں ان کا نقطہ نظر وہی ہے جو معتزلہ کا ہے؛ بلکہ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ زیدیہ سوائے 'منزلہ بین المنزلتین' کے معتزلہ کے بقیہ چاروں اُصولوں کو قبول کرتے ہیں۔

ان کے خاص خاص عقائد جو ان کو دوسرے فرقوں سے ممتاز کرتے ہیں، حسبِ ذیل ہیں :

(الف) افضل کی موجودگی میں مفضول مسلمانوں کا سربراہ ہوسکتا ہے؛ اسی لئے خلافت کے لئے افضل تو سیدنا حضرت علیؓ تھے؛ لیکن خلفائے ثلاثہ کی خلافت بھی درست تھی؛ اسی لئے وہ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ یا دوسرے صحابہ کی شان میں بدگوئی نہیں کرتے۔

(ب) رسول اللہ ﷺ نے حضرت علیؓ کو خلافت کے لئے مقرر فرمایا اور اس کے لئے ایسے اوصاف بیان کئے، جو اُن ہی پر منطبق ہوسکتے تھے، مگر آپ نے حضرت علیؓ کا نام لے کر متعین طور پر ان کے خلیفہ ہونے کا اعلان نہیں فرمایا؛ اس لئے جن صحابہ نے حضرت ابوبکرؓ کو امام مقرر کیا، انھوں نے حکم نبوی کی مخالفت کا قصد نہیں کیا تھا۔

(ج) امام ایسے شخص کو ہونا چاہئے جو ہاشمی ہو، فاطمی ہو، اس میں زہد وسخاوت اور شجاعت ہو، وہ لوگوں کو اپنی طرف دعوت دے، معروف کا حکم دے اور منکر سے روکے۔

(د) عالم اسلام کے دو مختلف خطوں میں الگ الگ امام مسلمین ہوسکتے ہیں۔

(ہ) وہ ائمہ کے معصوم ہونے کے قائل نہیں ہیں، وہ رجعت کے قائل بھی نہیں ہیں، جو شیعوں کا عقیدہ ہے کہ حضرت علیؓ دوبارہ زندہ کئے جائیں گے۔

(و) ان کے نزدیک امام کا کام شریعت کا تحفظ اور اس کی ترویج ہے، کائنات کے تکوینی اُمور ائمہ سے متعلق نہیں ہیں۔

(ز) معتزلہ کی طرح وہ بھی اس بات کے قائل ہیں کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب دائرہ ایمان سے باہر ہو جاتا ہے۔

۵- خوارج

خوارج کے بہت سے فرقے تھے، شیخ عبد القادر بغدادی اسفرائینیؒ نے ان کے ۲۰ فرقوں کا ذکر کیا ہے، ان میں دو بڑے فرقے ازارقہ اور اباضیہ تھے، جن کا مختصر ذکر آچکا ہے۔

ازارقہ کے بنیادی عقائد حسبِ ذیل ہیں :

(۱) حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور اپنے تمام مخالفین کو وہ کافر قرار دیتے تھے اور حضرت علیؓ کے قاتل عبدالرحمٰن بن ملجم کو لائق احترام وتوقیر سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ ان ہی کے حق میں یہ آیت نازل ہوئی ہے :

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِىْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ۔ (بقرہ:۲۰۷)

(۲) ان کے مخالفین کافر ہیں، وہ ہمیشہ کے لئے جہنم میں داخل کئے جائیں گے، ان سے قتال جائز ہے، ان کا ذبیحہ حرام ہے، ان کے زیر قبضہ علاقہ دار الحرب ہے، ان کے بچوں اور عورتوں کا بھی قتل جائز ہے، ان کے لئے دو ہی راستے ہیں: یا تو خوارج کی سوچ کے مطابق اسلام میں آجائیں یا پھر تلوار۔

(۳) جو شخص بھی جنگ میں شریک نہ ہو، چاہے وہ ان کا ہم عقیدہ ہی کیوں نہ ہو، وہ سب کے سب کافر اور مباح القتل ہیں، خواہ عورتیں ہوں یا بچے، بیمار ہوں یا ضعیف۔

(۴) ان کے مخالفین کے بچے بھی ہمیشہ جہنم میں رہیں گے اور ان کا خون حلال ہے۔

(۵) زانی کے لئے حد رجم نہیں اور پاکدامن مردوں پر تہمت لگائی جائے تو حد قذف نہیں ہے، صرف عورتوں پر تہمت لگانے والوں پر حد قذف ہے۔

(۶) یہود و نصاریٰ و مجوس کا قتل حرام ہے، چاہے وہ اہل ذمہ میں سے نہ ہوں۔

(۷) انبیاء سے بھی صغیرہ و کبیرہ گناہوں کا ارتکاب ہوسکتا ہے، یہاں تک کہ کفر کا بھی (نعوذ باللہ)۔

(۸) جو شخص گناہ کبیرہ کا مرتکب ہو، وہ کافر ہو جائے گا اور ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔

(۹) حائضہ عورتوں پر حالت حیض میں بھی نماز و روزہ واجب ہے۔

خوارج نے عام طور پر آیات و احادیث کے ظاہری الفاظ سے اور بے محل قیاس سے استدلال کیا ہے، خوارج کی جو آراء اور ان پر جو دلائل ذکر کئے گئے ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ قرآن مجید کی نصوص سے ان کا استدلال حد درجہ جمود اور کم شعوری پر مبنی ہوا کرتا تھا، مثلاً :

☆ ''وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ'' (مائدہ: ۴۴)

خوارج کا کہنا ہے کہ جو گناہ کبیرہ کا مرتکب ہے، وہ قرآن کے مطابق اپنے عمل کا فیصلہ نہیں کرتا ہے؛ اس لئے وہ کافر ہے۔

☆ ''وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ'' (آل عمران: ۹۷) اس آیت سے ان کا استدلال ہے کہ جو حج نہ کرے، وہ کافر ہے۔

☆ اپنے مخالفین کے بچوں اور عورتوں کے قتل کو درست قرار دینے پر ان کی دلیل یہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دُعاء کی کہ ایسا عذاب نازل کیجئے کہ کوئی گھر باقی نہ بچے اور ظاہر ہے کہ گھر میں عورتیں بھی تھیں اور بچے بھی تھے۔

☆ خوارج کا ایک فرقہ 'میمونہ' کے بانی میمون کا خیال تھا کہ بیٹی سے تو نکاح جائز نہیں ہے؛ لیکن پوتی سے نکاح جائز ہے، بھتیجیوں اور بھانجیوں سے تو نکاح جائز نہیں ؛ لیکن ان کی بیٹیوں سے نکاح جائز ہے؛ کیوں کہ قرآن مجید میں بیٹی کا ذکر آیا ہے نہ کہ پوتی کا، اور بھتیجیوں اور بھانجیوں کا ذکر آیا ہے نہ کہ ان کی لڑکیوں کا۔

☆ اسی طرح وہ احادیث کو بھی خاطر میں نہیں لاتے تھے، جیسے: حدیث میں پھوپھی اور بھتیجی اور خالہ اور بھانجی کو نکاح میں جمع کرنے سے منع کیا گیا ہے، ان کا کہنا تھا کہ قرآن میں صرف دو بہنوں کو جمع کرنے کی ممانعت ہے؛ اس لئے ان محرم رشتہ داروں کو نکاح میں جمع کرنا جائز ہے۔

☆ اسی طرح قرآن میں صرف رضاعی ماں کی حرمت کا ذکر آیا ہے؛ اس لئے رضاعی بہنوں، اور دوسری خاتون رضاعی رشتہ داروں سے نکاح کرنا جائز ہے۔

خوارج کا دوسرا ’’فرقہ اباضیہ‘‘ ہے، جس کا مختصر ذکر پہلے بھی آچکا ہے، یہ عبداللہ بن اِباض کے متبعین ہیں اور ان کے یہاں نسبتاً اعتدال پایا جاتا ہے، ان کے بنیادی عقائد حسب ذیل ہیں :

(۱) ان کے مخالفین کفار بمعنی مشرکین نہیں ہیں؛ بلکہ کفارِ نعمت ہیں، یعنی انھوں نے نعمتِ الٰہی کی قدردانی نہیں کی۔

(۲) ان کے مخالفین کا خون بھی حرام ہے اور ان کے زیر تصرف علاقے دارالتوحید ہیں نہ کہ دارالکفر؛ البتہ سلطان کا فوجی کیمپ دارالکفر ہے اور اس کے فوجیوں کا خون حلال ہے۔

(۳) اگر مسلمانوں سے جنگ ہو تو صرف ان سے حاصل کئے گئے ہتھیار حلال ہیں، بقیہ اسباب کا واپس کردینا واجب ہے۔

(۴) ان کے مخالف دوسرے مسلمانوں سے نکاح کرنا جائز ہے، ان کی گواہی معتبر ہے اور ان کے ساتھ ترکہ میں توارث قائم رہے گا۔

(۵) انسان کے افعال اللہ کے پیدا کردہ ہیں، اللہ ہی اپنی قدرت سے اس کو وجود میں لاتے ہیں؛ البتہ بندہ کا فعل کسب ہے۔

(۶) گناہ کبیرہ کا مرتکب کفرانِ نعمت کے معنی میں کافر ہے، کفر ملت کے اعتبار سے کافر نہیں۔

آج کل اباضیہ عمان میں برسراقتدار ہیں اور ان کی کچھ آبادی افریقی ملکوں میں بھی ہے۔

تمرینی سوالات

(۱) فرقہ معتزلہ کی بنیاد کس نے رکھی اور ان کو کیوں معتزلہ کہا جاتا ہے؟

(۲) معتزلہ کے پانچ بنیادی اُصول کیا ہیں؟

(۳) توحید کی وہ کیا تشریح کرتے ہیں؟

(۴) ''وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا'' اور ''وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا'' کی وہ کیا تاویل کرتے ہیں؟

(۵) یقیناً اللہ تعالیٰ عادل ہیں ؛ لیکن معتزلہ اللہ تعالیٰ کی صفتِ عدل کی کس طرح تشریح کرتے ہیں؟

(۶) اللہ تعالیٰ کے وعدہ و وعید کے سلسلے میں معتزلہ کا کیا نقطۂ نظر ہے؟

(۷) معتزلہ ایمان و کفر کے درمیان ایک اور درجہ مانتے ہیں ، اس سلسلے میں ان کا نقطۂ نظر کیا ہے اور اس درجہ میں کون لوگ شامل ہیں؟

(۸) امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے سلسلے میں معتزلہ کا تصور کیا ہے؟

(۹) فرقۂ زیدیہ اپنی نسبت کس شخصیت کی طرف کرتا ہے؟

(۱۰) زیدیہ اور معتزلہ کا کن نکات پر اتفاق ہے؟

(۱۱) کہا جاتا ہے کہ زیدیہ اہل سنت والجماعت سے قریب ہیں ، تو اس نسبت سے زیدیہ اور دوسرے شیعہ فرقوں کے معتقدات میں کیا فرق ہے؟

(۱۲) خوارج کے کتنے فرقے ہیں اور ان کے دو بڑے فرقوں کے نام کیا ہیں؟

(۱۳) خوارج کے چند اہم عقائد پر روشنی ڈالئے ، جن میں اہل سنت والجماعت سے ان کا اختلاف ہے؟

(۱۴) وہ گناہِ کبیرہ کے مرتکب کے کافر ہونے پر اور مخالفین کے بچوں اور عورتوں کے قتل کے جائز ہونے پر کیا استدلال کرتے ہیں؟

(۱۵) خوارج کے فرقۂ اِباضیہ میں نسبتاً اعتدال پایا جاتا ہے ، اس کی مثالیں ذکر کیجئے ؟

●●●

چوتھا باب

علم کلام — چھٹی صدی ہجری سے دورِ حاضر تک

تیسرا مرحلہ

تیسرا مرحلہ جو چھٹی صدی ہجری سے شروع ہو کر نویں صدی ہجری کے ختم تک رہا، علم کلام کے ارتقا میں نہایت اہم زمانہ ہے، اس عہد کی کچھ خصوصیات اس طرح ہیں :

(۱) فلسفہ میں جہاں طبیعات کی بحث آتی ہے، وہیں اس کا ایک حصہ 'الٰہیات' پر بھی مشتمل ہے، جس میں اللہ تعالیٰ کے وجود اور مابعد الطبیعی اُمور پر بحث کی جاتی ہے؛ چوں کہ یونانی فلسفہ کے بعض تصورات اسلامی افکار سے متصادم تھے اور اس کی وجہ سے اسلام پر اعتراض کیا جاتا تھا؛ اس لئے متکلمین اسلام نے فلسفیانہ نقطہ نظر سے بھی اسلامی معتقدات پر بحث کی، کہیں ان اُصولوں کو تسلیم کرتے ہوئے اسلامی نقطہ نظر کی توضیح کی گئی اور کہیں خود فلاسفہ کے نقطہ نظر کو رد کیا گیا، اس سلسلہ میں اہل سنت والجماعت میں امام فخر الدین رازیؒ اور علامہ سیف الدین آمدیؒ کا خاص طور پر ذکر کیا جاتا ہے۔

(۲) علم منطق اپنے نقطہ نظر پر استدلال کے لئے ایک اہم اُسلوب کی حیثیت سے یونانیوں کے یہاں رائج تھا، عباسی دور میں یونانی فلسفہ اور منطق بڑے پیمانے پر عربی زبان میں منتقل ہوا اور اس سے مختلف اسلامی علوم وفنون میں مدد لی گئی ، اُصولِ فقہ میں بھی بعض مباحث میں منطقی طرز استدلال اور اصطلاحات وتعبیرات سے فائدہ اُٹھایا گیا؛ لیکن سب سے زیادہ جس علم نے ان اصطلاحات کی مدد لی، وہ 'علم کلام' ہے؛ اس لئے کہ متکلمین کو جس گروہ پر رد کرنا پڑتا تھا، ان کا استدلال منطقی اُصولوں پر مبنی ہوتا تھا، اس منہج کو فروغ دینے میں امام الحرمینؒ، امام غزالیؒ، امام رازیؒ اور علامہ سیوطیؒ وغیرہ کا نمایاں حصہ ہے۔

(۳) علم کلام کی کتابوں کے منہج اور اس کی ترتیب وتبویب میں بھی تبدیلی آئی ، مثلاً پہلے علم کلام کی کتابیں حقیقت علم وغیرہ کی بحث سے شروع ہوتی تھیں، اب ان کتابوں کا آغاز

''الامور العامہ'' کے عنوان سے کیا جانے لگا، جس میں علم ومعرفت سے متعلق روایتی مباحث کے ساتھ ساتھ منطقی مباحث اور طبعیات کی بحث کا وہ حصہ جو تمام موجودات خواہ وہ واجب الوجود ہوں یا ممکن الوجود، پر روشنی ڈالتا ہے، کو بھی شامل کیا گیا؛ تاکہ الٰہیات کی بحث کو تقویت پہنچے، اس منہج کی ابتداء علامہ فخر الدین رازیؒ سے ہوئی اور علامہ آمدیؒ اور علامہ عضد الدین عبد الرحمٰن ایجیؒ وغیرہ نے اسی کو اختیار کیا۔

(۴) ایسی اصطلاحی کتابیں لکھی گئیں، جو بیک وقت کلام وفلسفہ دونوں کی اصطلاحات پر مشتمل ہیں، جیسے: ابن فورکؒ کی کتاب 'الحدود فی الاصول' اور علامہ آمدیؒ (متوفی: ۶۳۲ھ) کی تالیف 'المبین فی معانی الفاظ الحکماء والمتکلمین'۔

(۵) معتزلہ اس مرحلہ میں قریب قریب علم کلام کے منظر سے غائب ہوگئے؛ البتہ بعض ایسے افراد ضرور باقی رہے جو فکر اعتزال کے لئے جانے جاتے تھے، جیسے نیشاپور میں ابن بدران، بغداد میں ابن ابی الحدید وغیرہ؛ لیکن بحیثیت ایک فرقہ کے قریب قریب ان کا وجود ختم ہوگیا۔

(٦) ماتریدیہ کا فکری مرکز ماوراء النہر کا علاقہ تھا؛ لیکن اب اس کا مرکز برصغیر اور اس کے قرب وجوار کا علاقہ بن گیا اور اس خطے میں مذہب ماتریدی کو غلبہ حاصل ہوگیا۔

(۷) معتزلہ اور خوارج کے ختم ہوجانے کی وجہ سے عالم اسلام اور عالم عرب پر مذہب اشعری چھا گیا، کچھ علاقوں کو چھوڑ کر اشاعرہ اور ماتریدیہ نے تمام مسلمانوں کو اپنے زیر اثر لے لیا اور خود ان دونوں مکاتب فکر کے درمیان بھی قربت پیدا ہوئی، اشاعرہ کے مذہب کی تقویت میں ایک طرف سیاسی دخل رہا، مصر وشام میں سلطان صلاح الدین ایوبیؒ اور مغرب واندلس میں مہدی ابن تومرت نے سرکاری طور پر اس کی حوصلہ افزائی کی، نیز اسی دور میں قاضی بیضاویؒ، علامہ ایجیؒ، امام رازیؒ، تفتازانیؒ، علامہ جرجانیؒ اور دوانیؒ جیسی شخصیتیں پیدا ہوئیں۔

(۸) مذہب زیدیہ اگرچہ مائل بہ اعتدال مسلک تھا؛ لیکن اس میں بعض چھوٹے

چھوٹے شدت پسند گروہ بھی پیدا ہو گئے تھے، جو راہ اعتدال سے ہٹے ہوئے تھے، اس دور میں یہ گروہ بھی باقی نہیں رہے اور زیدی مذہب ایک مستقل اعتقادی مذہب کی حیثیت سے برقرار رہا۔

(۹) اسماعیلیوں کا وہ فرقہ جو 'نزاری' کہلاتا ہے اور جو اس وقت آغا خانی کے نام سے موسوم ہے، اس نے ۵۵۹ھ میں قیامت کبری کا اعلان کر دیا کہ اب قیامت شروع ہو گئی ہے، لہٰذا اب شریعت کے تمام ظاہری احکام منسوخ کئے جاتے ہیں، جب کہ اب تک وہ ظاہری اور باطنی دونوں قسم کی تاویلات کو ساتھ لے کر چلنے کا کم سے کم اظہار کیا کرتے تھے۔

(۱۰) اِباضیہ کے علاوہ جو عمان اور شمالی افریقہ میں ہیں، خوارج کا فرقہ ختم ہو گیا۔

(۱۱) اس عہد میں متون پر شروح وحواشی کو بڑا قبول حاصل ہوا اور اس میں سنی اور شیعہ متکلمین نے خوب بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، جیسے 'تجرید' کی شرح اہل سنت میں سے جلال الدین دوانی اشعری نے اور شیعوں میں قطب الدین شیرازی نے، اسی طرح علامہ ایجیؒ نے 'مواقف' اور اس کی شرح اور علامہ تفتازانیؒ نے 'مقاصد' اور اس کی شرح لکھی۔

(۱۲) اسی دور میں تاتاریوں کے ہاتھوں بغداد کا سقوط ہوا، پھر مصر عالم اسلام کا علمی اور فکری مرکز بنا، یہاں تک کہ جب محمد فاتح نے قسطنطنیہ فتح کیا اور عثمانی سلطان سلیم اول مصر میں داخل ہوا اور عباسیوں نے ان کے حق میں خلافت سے دستبرداری اختیار کر لی تو عالم اسلام کی سیاسی قیادت استنبول منتقل ہو گئی، اور مصر مذہب اشعری کا سب سے بڑا مرکز اور استنبول مذہب ماتریدی کا سب سے بڑا مرکز قرار پایا، اور چوں کہ خلافت عثمانیہ نے فقہ حنفی اور مذہب ماتریدی کو اختیار کیا؛ اس لئے اس دور میں مذہب ماتریدی کو وسعت حاصل ہوئی۔

چوتھا مرحلہ

چوتھا مرحلہ جو دسویں صدی ہجری سے لے کر بارہویں صدی ہجری یعنی تین صدیوں پر محیط ہے، اس دور میں علم کلام کو کوئی خاص ترقی حاصل نہیں ہوئی اور وہ اپنے پچھلے اُسلوب اور طریق پر ہی قائم رہا، اس دور کی چند قابل ذکر باتیں یہ ہیں :

(۱) قدیم کلامی متون وشروح پر بہت سے حواشی لکھے گئے، جیسے مرزا جان حبیب اللہ شیرازیؒ، عبد الحکیم بن شمس الدین سیالکوٹیؒ، احمد بن موسیٰ خیالیؒ، عصام الدین ابراہیم محمد الاسفرائنیؒ وغیرہ، یہ وہ علمی سرمایہ ہے جو ایک زمانہ تک دینی جامعات کے نصاب کا حصہ بنا رہا۔

(۲) بحیثیت مجموعی صفویوں کی حکومت آنے کے بعد ایران میں اثنا عشری مذہب کو، ترکی اور ہندوستان میں مذہب ماتریدی کو، مصر، افریقہ اور عالم عرب میں مذہب اشعری کو غلبہ حاصل ہو گیا۔

(۳) مدرسہ ماتریدیہ کو علمی اور فکری اعتبار سے بھی ترقی حاصل ہوئی اور اس میں علامہ ایوب بن موسیٰ کفویؒ، احمد بن محمد قسطلانیؒ، ملا علی بن سلطان قاریؒ، اور ان جیسے بڑے بڑے اہل علم پیدا ہوئے۔

پانچواں مرحلہ

یہ مرحلہ تیرہویں صدی ہجری کے آغاز سے اب تک کا ہے، اس دور کی خاص خاص باتیں یہ ہیں :

(۱) سعودی حکومت کے قیام سے فکر حنبلی کو ایک نئی طاقت حاصل ہوئی، اور اس فکر کے شارح کی حیثیت سے علامہ ابن تیمیہؒ کی تعلیمات اور تشریحات کو اس حلقہ میں قبول عام حاصل ہوا۔

(۲) تیسرے اور چوتھے ادوار میں علم کلام میں منطق وفلسفہ کا بہت زیادہ دخل ہو گیا تھا اور فلسفہ ومنطق کے مسلّمہ اُصول واصطلاحات کی بنیاد پر کلامی مسائل کی وضاحت کی جاتی تھی؛ لیکن اس عہد میں اجنبی اثرات سے بچتے ہوئے کتاب وسنت کی طرف واپسی کی تحریک شروع ہوئی۔

(۳) اس دور میں ارتداد کے کئی فتنے اُٹھے، ایران میں بابی اور بہائی، اور ہندوستان میں قادیانی، اس کی وجہ سے اسلامی عقائد کے مباحث میں توسیع کرنی پڑی اور اُن اسلامی مسلّمات کو داخل کرنا پڑا، جو اَب تک اس اہمیت کے ساتھ علم کلام کا جزو نہیں تھے؛ لیکن ان

فتنوں کے رد کے لئے اب ان کو بنیادی اہمیت حاصل ہوگئی ہے، جیسے: ختم نبوت اور نزول مسیح وغیرہ کا مسئلہ۔

(۴) یہ وہ دور ہے جس میں عالم اسلام اور مسلمانوں پر مغرب کی طرف سے سیاسی اور فوجی تغلب کے ساتھ ساتھ فکری یلغار بھی شروع ہوگئی، عیسائی مشنریز مسلمانوں میں کام کرنے لگیں، جو اسلام کی بنیادی تعلیمات کو نشانہ بناتی تھیں، کمیونسٹ تحریک اُبھری، جس کی بنیاد الحاد پر تھی، اس کی وجہ سے عیسائیت اور کمیونزم کا رد علم کلام کا ایک نیا موضوع بن گیا۔

چنانچہ عالم اسلام کے مختلف حصوں میں اس کے ابطال کی کوششیں کی گئیں، جن میں سب سے نمایاں نام مصر کا ہے؛ کیوں کہ آبادی، تعلیم اور باصلاحیت افراد کے لحاظ سے عالم عرب میں اس کو نمایاں حیثیت حاصل ہے؛ اس لئے وہاں کے سلیم الفکر اہل علم نے اس پر نسبتاً زیادہ توجہ دی، عجمی ممالک میں اس موضوع پر سب سے زیادہ توجہ برصغیر میں دی گئی، برصغیر میں ماضی قریب میں انجام دی جانے والی متکلمانہ خدمات کی دو جہتیں ہیں، ایک جہت: مستشرقین اور مستشرقین سے متاثر مغرب زدہ لوگوں کے سوالات کا جواب، دوسری جہت: مسلمانوں کے اندر ضعفِ عقیدہ کی وجہ سے پیدا ہونے والے مبتدعانہ افکار و افعال کا رد، یا اپنے آپ کو اسلام کی طرف منسوب کرنے والے فرقِ ضالہ کی تردید۔

پہلی جہت سے متکلمانہ خدمات کا نقطۂ آغاز حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ کو قرار دیا جاسکتا ہے، جنھوں نے ’حجۃ اللہ البالغۃ‘ تصنیف کی؛ تاکہ اسلامی احکام کو عقل و مصلحت کی ترازو میں تول کر سمجھا یا جاسکے، شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی دُوررس نظر نے محسوس کرلیا کہ مستقبل میں اسلام کے تمام شعبوں —— اعتقادات، عبادات اور معاملات وغیرہ —— کے بارے میں سوالات اُٹھائے جائیں گے اور اسلامی نقطۂ نظر کو خلافِ عقل اور خلافِ فطرت ثابت کرنے کی کوشش کی جائے گی؛ اس لئے ضروری ہے کہ اسلامی تعلیمات کے عقل و حکمت اور ضرورت و مصلحت کے موافق ہونے کو ثابت کیا جائے، اسلامی اعتقادات کے اثبات کے نقطۂ نظر سے دوسری بڑی اہم خدمت حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ (بانیٔ دارالعلوم دیوبند) کی

ہے، انھوں نے عقلی طور پر اسلام کے خلاف اُٹھائے جانے والے اعتراضات کے مؤثر اور مسکت جوابات دیئے، حضرت نانوتویؒ کی فکر وبصیرت کی نمائندہ ایک اہم شخصیت تھی حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی، جن کا رسالہ ''العقل والنقل'' بڑا اہم ہے اور ان کے تفسیری حواشی نیز مسلم کی شرح ''فتح الملہم ''میں جا بجا بہت مفید اور مدلل متکلمانہ بحثیں آ گئی ہیں، اسی سلسلۃ الذہب کی ایک کڑی حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ ہیں، جو یوں تو فقہ وفتاویٰ اور تصوف کے مردِ میدان سمجھے جاتے ہیں؛ لیکن حقیقت یہ ہے کہ تمام ہی اسلامی علوم میں ان کا پایہ بہت بلند ہے، ان کی کتاب ''المصالح العقلية للاحكام النقليه'' گویا 'حجۃ اللہ البالغۃ' کا تسلسل ہے، اور ان کا رسالہ ''الانتبهات المفيده عن الاشتبهات الجديدة'' مختصر ہونے کے باوجود بے حد مفید ہے، اس کے علاوہ آپ کی تفسیر ''بیان القرآن'' میں بھی صفاتِ باری اور مسئلہ تقدیر وغیرہ کے ذیل میں بڑی اہم بحثیں آ گئی ہیں۔

مستشرقین کے رد میں علامہ شبلی نعمانیؒ اور علامہ سید سلیمان ندویؒ کی تحریریں بہت اہم ہیں اور انھوں نے مستشرقین ہی کے نہج پر ان کا رد کیا ہے، ان کی بعض آراء سے اختلاف تو کیا جا سکتا ہے؛ لیکن ان کی کوششوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، مستشرقین نے خاص طور پر بہت قوت کے ساتھ ''انکارِ حدیث'' کا فتنہ اُٹھایا اور اسے پروان چڑھایا: کیوں کہ اگر حدیث کو حجت نہ مانا جائے تو پھر قرآن میں معنوی تحریف کا بھی راستہ کھل جاتا ہے، اس فتنہ کا مقابلہ کرنے میں بھی علماء ہند کا کام بہت وقیع ہے، جس میں حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ اور ڈاکٹر محمد حمید اللہ حیدرآبادیؒ کے نام سرفہرست ہیں، جنھوں نے اس موضوع پر ''تدوین حدیث'' اور ''الوثائق النبویۃ'' کی تالیف فرمائی، اسی طرح اسلامی معتقدات کے اثبات میں مولانا گیلانی کی ''الدین القیم'' بھی ایک اہم کتاب ہے، ان حضرات کے بعد اور بھی بہت سے اہل علم نے مستشرقین اور ان سے متاثر تجدد پسند گروہ کے رد میں کام کیا ہے اور اب بھی اس کا سلسلہ جاری ہے۔

مغربی طاقتوں نے عالم اسلام پر قبضہ کے بعد وہاں عیسائیت پھیلانے کی منظم کوشش کی

اور اس کے لئے مسلم معاشرہ میں عیسائی مشنریز کا جال بچھا دیا، اس محاذ پر یوں تو بہت سے اہل علم نے خدمت کی ہے ؛ لیکن مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کی تالیف ''اظہار الحق'' ایک لاجواب کتاب ہے، آج تک عیسائی دنیا اس کا جواب نہیں دے سکی اور بعد میں جناب احمد دیدات کے بشمول ردعیسائیت پر جو بھی کام ہوا، اس کا ماخذ یہی کتاب ہے۔

ایک بڑا فتنہ انگریزوں کی شہ پر قادیانیت کا پیدا ہوا اور تیزی سے پورے برصغیر میں پھیلنے لگا، اللہ کا شکر ہے کہ اس پس منظر میں علماء اسلام نے ختم نبوت کے موضوع پر اتنا لکھا کہ ایک پورا کتب خانہ تیار ہوگیا ہے؛ لیکن ابتدائی مرحلہ میں اس فتنہ کے تعاقب کی جن بزرگوں نے سب سے زیادہ فکر کی، وہ ہیں: حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ اور علامہ سید انور شاہ کشمیریؒ۔

اسی طرح ایک فتنہ آریہ سماجوں کی طرف سے اُٹھا، جس میں مسلمانوں کو ہندو مذہب کی طرف لوٹنے کی دعوت دی جارہی تھی ، اس کے مقابلہ میں بھی حضرت نانوتویؒ اور حضرت مونگیریؒ کی خدمات بہت اہم ہیں اور اس میں شبہ نہیں کہ ان دونوں فتنوں کے تعاقب میں مسلمانوں کے تمام ہی مسالک کے بزرگوں نے اپنے اپنے دائرۂ اثر میں اور اپنی اپنی صلاحیت کے مطابق حصہ لیا ہے۔

دوسری جہت سے بھی برصغیر کے علماء نے اہم خدمات انجام دی ہیں، اس سلسلہ میں شاہ اسماعیل شہیدؒ کا نام بہت نمایاں ہے، جنھوں نے اپنی تقریر وتحریر کے ذریعہ پوری قوت کے ساتھ مشرکانہ خیالات اور مروجہ بدعات کا رد فرمایا، ان کی کتاب ''تقویۃ الایمان'' عقیدۂ توحید کی بے لاگ وضاحت ہے، جس کا عربی ترجمہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے قلم سے ''رسالۃ التوحید'' کے نام سے چھپ چکا ہے، شاہ اسماعیل شہیدؒ کے بعد اس سلسلے میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ کی خدمات بہت نمایاں ہیں اور انھوں نے اس قوت کے ساتھ رد بدعت کا کام کیا کہ بعض دفعہ خود اپنے بزرگوں کے نقطۂ نظر کے خلاف بھی قلم اُٹھانے میں ان کو تأمل نہیں ہوا۔

ہندوستان میں جو عجمی نزاد حکومتیں قائم ہوئیں، ان میں بہت سے سلاطین یا تو شیعیت سے

متاثر تھے یا باضابطہ شیعہ تھے، اس کی وجہ سے مسلمانوں میں صحابۂ کرام کے بارے میں سوءِ اعتقاد عام ہوگیا تھا اور شیعیت کے زیر اثر بدعات کو فروغ ہو رہا تھا، ان کے رد میں شاہ ولی اللہ صاحبؒ اور بعد کے اہل علم نے اہم خدمات انجام دیں؛ تاہم اس سلسلہ میں سب سے نمایاں خدمت حضرت مولانا عبدالشکور فاروقیؒ کی ہے، ان کی کتابوں نے اصلاح عقیدہ میں بہت ہی مؤثر کردار ادا کیا ہے، خود لکھنؤ شہر کی فضا تبدیل ہوگئی، جہاں خطبۂ جمعہ میں خلفاء راشدین کا نام بھی نہیں لیا جاسکتا تھا۔

غرض کہ برصغیر میں علم کلام کی دونوں جہتوں —— یعنی ادیانِ باطلہ کا ابطال اور فرقِ ضالہ کا رد —— کے پہلو سے بڑی اہم خدمات انجام پائیں اور آج بھی اس کا تسلسل قائم ہے۔

(۵) اس عہد میں ایک نیا رجحان سائنسی حقائق کے ذریعہ اسلامی معتقدات کو ثابت کرنے کا اُبھرا ہے اور اب جب کہ یونانی منطق وفلسفہ کا دور ختم ہو چکا ہے، اس منہج کی بڑی اہمیت ہے، اس کا آغاز تو مصر کے بعض مصنفین سے ہوا؛ لیکن اس سلسلہ میں برصغیر کی بھی نمایاں خدمات ہیں؛ البتہ جو سائنسی نظریات مشاہدات کے ذریعہ ثابت ہو چکے ہیں اور وہ اسلامی معتقدات کو ثابت کرنے میں معاون ہیں، ان سے استفادہ کرنا تو مناسب ہے، مگر جو نظریات ابھی ثبوت کے درجہ میں نہیں ہیں، یا قرآن وحدیث کی صراحت کے خلاف ہیں، وہ قابل قبول نہیں ہیں۔

(۶) اس دور کا ایک افسوسناک پہلو یہ ہے کہ اس میں اشاعرہ وماتریدیہ سے حنابلہ (جس کو آج کل ''سلفی مذہب'' کہا جاتا ہے) کی آویزشیں بڑھ گئیں، یہاں تک کہ ان میں سے غالی لوگ اہل سنت کے ان دونوں متفق علیہ اعتقادی مسالک کو ضال ومضل قرار دینے لگے، یہ بات آج دنیا کے مختلف ملکوں میں اہل سنت والجماعت کے درمیان انتشار کا باعث بنی ہوئی ہے۔

(۷) یوں تو اعتزال ایک فرقہ وگروہ اور مستقل مذہب کی حیثیت سے باقی نہیں رہا؛ لیکن یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ فکر اعتزال —— یعنی قرآن وحدیث کے مقابلہ میں عقل کو ترجیح دینا

اوراس کے لئے آیات واحادیث میں دورازکارتاویل کرنا —— بالکلیہ ختم نہیں ہوا، بالخصوص موجودہ دور میں مغرب کی طرف سے جو یلغار ہورہی ہے، اس کے رد میں جن لوگوں نے قلم اُٹھایا ہے اور جنھوں نے اسلام اور عقل وسائنس کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی ہے، اگر چہ ان کی یہ کوشش مقصد کے اعتبار سے بہتر ہیں؛ لیکن افسوس ہے کہ ان میں سے بعض حضرات نے انسانی عقل کی نارسائی اور قرآن وحدیث کی حقانیت کو ثابت کرنے کے بجائے معتزلہ کی دور ازکار اور خلاف ظاہر تاویلات اور توجیہات کا راستہ اختیار کرلیا؛ حالاں کہ جیسے انسان کے حواس ظاہرہ کا دائرہ محدود ہے، اسی طرح اس کی عقل کا دائرہ بھی محدود ہے؛ لہٰذا اول تو قرآن وحدیث میں کوئی بات خلافِ عقل ہو نہیں سکتی؛ لیکن اگر قصورِ فہم کی وجہ سے ایسا نظر آئے تو صحیح طریقہ یہ ہے کہ قرآن وحدیث کے بیان کا یقین کیا جائے اور اس کے مقابل نقطۂ نظر کو رد کردیا جائے، اس سلسلہ میں خاص طور پر برصغیر میں سرسید احمد خاں مرحوم اور مصر میں محمد عبدہ مرحوم اوران سے متاثرین کا ذکر کیا جاسکتا ہے؛ لہٰذا یہ کہنا بے جانہ ہوگا کہ ایک کلامی مسلک کی حیثیت سے تو معتزلہ ختم ہوگئے؛ لیکن ان کی فکر اب بھی باقی ہے۔

تمرینی سوالات

(۱) علم کلام کے ارتقاء کا تیسرا مرحلہ کب سے کب تک شمار کیا جاسکتا ہے؟

(۲) تیسرے مرحلہ کی خصوصیات کیا ہیں؟

(۳) چوتھے مرحلہ کی خاص خاص باتیں کیا ہیں؟

(۴) پانچویں مرحلے کی خصوصیات کیا ہیں؟

(۵) اس مرحلہ میں مغرب کی فکری یلغار کا مقابلہ کرنے کے لئے مسلمان علماء نے کیا خدمات انجام دی ہیں؟

● ● ●

آسان علم کلام

پانچواں باب

اہلِ سنت کے اعتقادی مسالک

اہل السنۃ والجماعۃ

''اہل السنۃ والجماعۃ'' کا نام دو اجزاء کو شامل ہے، ایک: سنت، دوسرے: جماعت، سنت سے مراد رسول اللہ ﷺ کے اقوال، افعال اور تقریرات ہیں، متعدد فرقِ باطلہ حدیث یا حدیث کی ایک خاص قسم خبر واحد کا انکار کرتے ہیں، یا جب ان کے گمان کے مطابق حدیث اور عقل میں تعارض ہوتا ہے تو عقل کو ترجیح دیتے ہیں اور حدیث کو رد کر دیتے ہیں، ''اہل السنۃ والجماعۃ'' میں سنت کے لفظ سے اس طرف اشارہ ہے کہ وہ حدیث کو حجت مانتے ہیں اور جو حدیث اہل فن کے نزدیک راویوں کی صحت یا دوسرے قرائن جیسے قرآن مجید سے موافقت وغیرہ کی وجہ سے معتبر مانی گئی ہے، ان سب کو قبول کرتے ہیں، خواہ یہ حدیث خبر متواتر ہو یا خبر مشہور یا خبر واحد، اور چاہے ہماری کوتاہ عقل اس کی حقیقت کا ادراک کر سکے یا نہیں۔

''سنت'' کے مقابلہ ''بدعت'' کا لفظ ہے، بدعت سے وہ عقیدہ اور عمل مراد ہے جس کے لئے عہد نبوی اور عہد صحابہ میں کوئی اصل نہیں ہو؛ اس لئے ''اہل السنۃ'' میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ یہ گروہ کسی بھی بدعت کو قبول نہیں کرتا، چاہے اس کا تعلق عقیدہ سے ہو، جیسے: روافض کا اپنے ائمہ کو معصوم تصور کرنا، یا اپنے آپ کو اہل سنت کہنے والے ایک گروہ کا رسول اللہ ﷺ کو عالم الغیب قرار دینا، یا کسی عمل سے ہو، جیسے: شیعوں کا ماتم کرنا، یا قبروں پر عرس کرنا وغیرہ۔

''جماعت'' سے کیا مراد ہے؟ اس میں اہل علم کے مختلف اقوال ہیں، راجح یہ ہے کہ اس سے صحابہ کی جماعت مراد ہے :

والثالث : ان الجماعة هى جماعة الصحابة على الخصوص فإنهم الذين أقاموا عِماد الدين وأرسوا

أوتاد ، وهم الذين لا يجتمعون على ضلالة اصلاً ،
وقد يمكن فى من سواهم ذالك ۔ (۱)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات میں بھی اس کا اشارہ ہے :

... تفترق أمتى ثلاث و سبعين ملة ، كلهم فى النار
إلا ملة واحدة ، قالوا : ومن هى يا رسول الله ! قال : ما
أنا عليه وأصحابى ۔ (۲)

ایک اور موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا :

فإنه من يعش منكم بعدى فسيرى اختلافا كثيراً ،
فعليكم بسنتى وسنة الخلفاء المهديين الراشدين
تمسكوا بها و عضوا عليها بالنواجذ ، و إياكم
ومحدثات الأمور ، فإن كل محدثة بدعة وكل بدعة
ضلالة ۔ (۳)

لہٰذا اہل سنت والجماعت وہ گروہ ہے جو :

☆ معتبر طریقہ پر ثابت تمام حدیثوں کو مانتا ہے۔
☆ بدعت سے اجتناب کرتا ہے۔
☆ صحابہؓ کے طریقہ پر قائم ہے۔
☆ تمام صحابہؓ کا احترام کرتا ہے۔

اہل سنت والجماعت اگرچہ عقیدہ سے متعلق بنیادی مسائل پر متفق ہیں اور ان کے درمیان کوئی ایسا اختلاف نہیں ،جس کی وجہ سے تکفیر وتضلیل کی نوبت آئے ؛ تاہم اعتقادی مسائل کی توضیح وتشریح میں جو اختلاف رائے پایا جاتا ہے، ان کے اعتبار سے اہل سنت کے تین مکاتبِ فکر پائے جاتے ہیں :

---

(۱) الاعتصام للشاطبی: ۳/ ۲۱۷۔ (۲) ترمذی، عن عبد اللہ بن عمرو، باب ما جاء فی افتراق ھذہ الامۃ، حدیث نمبر: ۲۶۴۱۔ (۳) ابوداؤد، باب فی لزوم السنۃ، حدیث نمبر: ۴۶۰۷۔

(۱) اَشاعرہ۔

(۲) ماتریدیہ۔

(۳) حنابلہ۔

اَشاعرہ

اس مکتبِ فکر کے بانی امام ابوالحسن الاشعریؒ ہیں، جن کا اصل نام علی بن اسماعیل ہے، یہ ۲۷۰ھ میں بصرہ میں پیدا ہوئے اور ۳۳۰ھ میں بغداد میں وفات پائی، انھوں نے نہ صرف اپنے زمانہ کے سب سے بڑے معتزلی عالم عبدالوہاب ابوعلی الجبائیؒ سے تعلیم حاصل کی؛ بلکہ ان ہی کے گھر میں پرورش پائی؛ کیوں کہ جبائی ان کے استاذ بھی تھے اور سوتیلے والد بھی، ایک دن ایسا ہوا کہ ایک شخص ابوعلی الجبائی کے پاس آیا اور اس نے دریافت کیا کہ ہمیں تین بھائیوں کے بارے میں بتایئے کہ جن میں سے ایک کا بڑے ہوکر کفر کی حالت میں انتقال ہوا، دوسرے نے بڑے ہونے کے بعد ایمان کی حالت میں وفات پائی، اور تیسرا نابالغی ہی میں فوت ہوگیا، آپ جو یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ پر وہ عمل واجب ہے جو بندوں کے لئے اصلح ہو؛ تاکہ اللہ تعالیٰ کے عادل ہونے کا تقاضا پورا ہو تو اس قاعدہ کے لحاظ سے ان تینوں کا کیا انجام ہوگا؟ جبائی نے جواب دیا: ''جو بڑا ہوکر ایمان کی حالت میں دنیا سے گیا، وہ جنت کا مستحق ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا، اور جو کفر کی حالت میں دنیا سے گیا، وہ ہمیشہ دوزخ میں رہے گا، اور جس کی موت نابالغی کی حالت میں ہوئی، اس کا درجہ ان دونوں کے درمیان ہے'' اس شخص نے سوال کیا: اگر نابالغی کی حالت میں مرنے والا اللہ تعالیٰ سے پوچھے کہ آپ تو وہ عمل کرتے ہیں جو بندوں کے لئے اصلح ہو تو آپ نے ہی ہمیں بڑا کر کے ایمان کی حالت میں کیوں نہیں اُٹھایا، تو کیا جواب ہوگا؟ جبائی نے کہا: ''اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ یہ بات میرے علم میں تھی کہ بڑے ہونے کے بعد تم ایمان کے بجائے کفر کی طرف چلے جاؤ گے'' اس شخص نے دریافت کیا: ''پھر اگر وہ شخص جو بڑا ہوکر کفر کی حالت میں دنیا سے رخصت ہوا، اور دوزخ میں داخل ہوا، اللہ تعالیٰ

سے سوال کرے کہ میرے لئے آپ نے اصلح کا انتخاب کیوں نہیں کیا کہ مجھے بھی میرے ایک بھائی کی طرح بڑے ہونے کے بعد ایمان کی توفیق عطا کرتے اور میں جنت میں داخل ہوتا، تو اللہ تعالیٰ کیا جواب دیں گے؟'' ابوعلی الجبائی اس کا کوئی جواب نہیں دے سکے۔

یہیں سے امام ابوالحسن الاشعریؒ کے دل میں تذبذب کا کانٹا چبھنے لگا اور وہ چالیس دنوں تک اپنے گھر میں خلوت گزیں ہوکر معتزلہ اور اہل سنت کے مسائل پر غور کرتے اور ان کے دلائل کے درمیان تقابل کرتے رہے، یہاں تک کہ ان کو شرح صدر ہوگیا کہ اہل سنت والجماعت ہی کا مذہب درست ہے؛ چنانچہ وہ بصرہ کی جامع مسجد میں آئے، منبر پر بیٹھ کر لوگوں سے خطاب کیا اور فرمایا: ''اے لوگو! جو مجھے جانتا ہے، وہ جانتا ہے، اور جو نہیں جانتا، میں اس سے تعارف کرادوں کہ میں فلاں بن فلاں ہوں، میں خلق قرآن کا قائل تھا، اس بات کا قائل تھا کہ اللہ تعالیٰ کا آنکھوں سے دیدار نہیں کیا جاسکتا، اس بات کا بھی قائل تھا کہ افعال شر کا فاعل میں خود ہوں اور مختلف باتیں جن کے معتزلہ قائل تھے، ان کو شمار کرایا، پھر معتزلہ کے مذہب سے توبہ کرلی اور ان کی تردید پر کمربستہ ہوجانے کا اعلان کیا، اور کہا کہ میں ان تمام باتوں سے باز آتا ہوں، جس کا میں عقیدہ رکھتا تھا'' ان کے تذکرہ نگاروں نے نقل کیا ہے کہ خواب میں بھی ان کو اس کی ہدایت ہوئی تھی۔

اس کے بعد امام ابوالحسن الاشعریؒ کا ایک دوسرا دور شروع ہوا، جس میں وہ اہل سنت والجماعت کی فکر کے بڑے حامی وناصر اور معتزلہ کے سب سے بڑے ناقد بن کر اُبھرے، ان کی فکر کو ان کے شاگردوں ابوسہل صعلوکیؒ (۳۶۹ھ)، ابوبکر قفالؒ (۴۱۷ھ)، ابوزید مروزیؒ، زاہر بن احمدؒ، حافظ ابوبکر جرجانیؒ، شیخ ابومحمد طبریؒ، ابوعبداللہ طائیؒ، ابوالحسن باہلیؒ، بندار بن حسن صوفیؒ وغیرہ نے — جو اپنے عہد کے نامور علماء تھے — تقویت پہنچائی؛ لیکن مذہب اشعری کو جن شخصیتوں کی وجہ سے عروج وقبول حاصل ہوا اور پوری مسلم دنیا میں اس کو پذیرائی ملی، اس کا سبب اگلی نسل کے لوگ تھے، جیسے: ابوبکر باقلانیؒ، ابواسحاق اسفرائینیؒ، ابوبکر بن فورکؒ، جو امام اشعری کے شاگردوں کے شاگرد تھے، پھر ان بزرگوں کے شاگردوں میں امام الحرمین

جوینیؒ کا نام آتا ہے، جو اپنے زمانہ کے شیخ الاسلام تھے، اور عراق سے لے کر اسلامی مملکت کی آخری سرحدوں تک ان ہی کے فتوے چلتے تھے، اس بنا پر اشعری مکتبہ فکر مسلم دنیا کے گھر گھر پہنچ گیا، پھر اشاعرہ کی صف میں امام الحرمین کے شاگرد امام غزالیؒ جیسا متکلم اسلام پیدا ہوا اور ان کے ذریعہ اہل علم کے درمیان ان کی مقبولیت میں مزید اضافہ ہوا، امام غزالیؒ کے بعد پھر ہمیں اس میدان میں امام فخر الدین رازیؒ جیسے صاحب نظر، منقولات اور معقولات کی جامع شخصیت نظر آتی ہے، جس نے مذہب اشعری کو استدلال کے اعتبار سے نئی بلندی عطا کی۔

امام ابوالحسن الاشعریؒ چوں کہ اعتزال سے تائب ہوکر اہل سنت والجماعت کی طرف آئے تھے؛ اس لئے انھوں نے خاص طور پر ان مسائل کو اپنی پہچان بنایا، جن میں ان کو معتزلہ سے اختلاف ہوا، اور اعتدال اور میانہ روی کا راستہ اختیار کیا، مثلاً :

(۱) توحید کے سلسلہ میں نہ انھوں نے معتزلہ کی رائے اختیار کی، جو اللہ تعالیٰ کے لئے صفات کے قائل ہی نہیں ہیں اور نہ حشویہ کی فکر کو قبول کیا، جنھوں نے اللہ تعالیٰ کی صفات کو مخلوق کی طرح قرار دے دیا، یہاں تک کہ ان کا مذہب تجسیم تک پہنچ گیا؛ بلکہ ایک درمیانی راستہ اختیار کیا کہ اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں؛ لیکن نہ وہ ان کا عین ہیں اور نہ ان کا غیر، اور نہ یہ صفات مخلوقات کے مشابہ ہیں۔

(۲) معتزلہ نے عدل کا نظریہ اختیار کیا تھا، جس میں انسان کو خود اپنے افعال کا خالق قرار دیا گیا ہے، امام ابوالحسن الاشعریؒ نے یہ نقطہ نظر اختیار کیا کہ افعال کے خالق تو اللہ تعالیٰ ہیں؛ لیکن بندوں کو 'کسب' کا اختیار دیا گیا ہے اور جو جس بات کو اختیار کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کے ارادہ سے وہ پوری ہوتی ہے، اور انسان کو کسب کی بنیاد پر عذاب وثواب دیا جاتا ہے۔

(۳) معتزلہ کے یہاں ایمان میں اعمال کی ایسی اہمیت ہے کہ عمل کے فوت ہونے کی وجہ سے مسلمان دائرہ ایمان سے باہر نکل جاتا ہے، امام اشعریؒ نے فرمایا کہ ایمان تصدیق قلبی کا نام ہے، اعمال ایمان کا رکن نہیں؛ لیکن یہ کمالِ ایمان کے لئے شرط ہے، عمل کے ترک سے انسان گناہ گار تو ہوتا ہے؛ لیکن دائرۂ ایمان سے باہر نہیں نکل جاتا، نیز دوزخ ہمیشہ کے لئے اس کا ٹھکانہ نہیں بن جاتی ہے۔

(۴) اللہ تعالیٰ پر کوئی بات واجب نہیں، نہ اعمالِ صالحہ کی وجہ سے ثواب اور نہ گناہ کی وجہ سے عذاب، اللہ تعالیٰ اہل اطاعت کو ثواب دیں تو یہ اس کا فضل ہے اور مرتکبین گناہ کو عذاب دیں تو یہ اس کا عدل ہے، اور وہ چاہیں تو ان کو بھی معاف کر دیں۔

(۵) امام عادل کی اطاعت واجب ہے اور اگر وہ فاسق ہو یا فسق میں مبتلا ہو جائے تب بھی اس کے خلاف بغاوت واجب نہیں۔

اسی طرح امام اشعریؒ نے اثنا عشری مذہب اور دیگر شیعہ فرقوں کے مقابلہ میں معتدل نظریہ اختیار کیا، جو اہل سنت کا مشہور مذہب ہے کہ حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان اور حضرت علی —— رضی اللہ عنہم اجمعین —— سب کے سب خلفائے برحق ہیں، اور ان میں فضیلت کی ترتیب بھی وہی ہے، جو ترتیب ان کی خلافت میں ہے، نیز یہ کہ مشاجرات صحابہ پر گفتگو کرنے سے بچا جائے اور اس کو اللہ کے حوالہ کر دیا جائے۔

معتزلہ اور اہل سنت کے درمیان جو اُصولی اختلافات ہیں، ان کو جزئیات پر منطبق کرنے کے لحاظ سے دو مسئلوں میں اختلاف زیادہ زیر بحث رہا ہے، ایک: رویت باری، دوسرے: معجزات، معتزلہ رویت باری کے قائل نہیں ہیں، نہ اس دنیا میں اور نہ عالم آخرت میں، اہل سنت آخرت میں رویت باری کے قائل ہیں؛ اس لئے انھوں نے کہا کہ کسی چیز کو دیکھے جانے کے لئے اس کا کسی خاص جگہ پر متحیز ہونا یا ذی جسم ہونا ضروری نہیں۔

معتزلہ معجزات کے بھی قائل نہیں ہیں اور قرآن مجید میں جن معجزات کا ذکر آیا ہے، وہ ان کی تاویل کرتے ہیں؛ کیوں کہ ان کے نزدیک جب کوئی علت پیدا ہو جائے تو اس کے معلول کا پیدا ہونا ضروری ہے، جیسے: پانی ہو تو ضروری ہے کہ وہ ڈبوئے، امام اشعریؒ کا نقطہ نظر یہ ہے کہ واقعی علت و معلول ایک دوسرے کے ساتھ وجود میں آتے ہیں؛ لیکن اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہیں کہ کسی خاص واقعہ میں علت و معلول کے رشتہ کو توڑ دیں۔

صفات باری کے سلسلہ میں امام اشعریؒ کا نقطہ نظر یہ ہے کہ سات صفات اللہ تعالیٰ کی صفات ذاتیہ ہیں: (۱) علم، (۲) قدرت، (۳) ارادہ، (۴) سمع، (۵) بصر، (۶) کلام، (۷) علو۔

یہ صفات کبھی بھی اللہ تعالیٰ سے الگ نہیں ہو سکتے ،قرآن بھی اللہ تعالیٰ کی صفت ِکلام کا حصہ ہے؛اس لئے یہ بھی ازلی اورابدی ہے،اس کے علاوہ جوصفات ہیں وہ صفات فعلیہ ہیں، جیسے استواءعلی العرش،اللہ تعالیٰ کا نزول،اللہ تعالیٰ کا آناوغیرہ،یہ اللہ تعالیٰ کی مشیت سے متعلق ہیں،اللہ جب چاہیں ان کوکریں اورجب چاہیں نہ کریں۔

مذہبِ اشعری— تدوین وارتقاء

مذہب اشعری کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ تدوین وارتقاء کے اعتبار سے اس پر دو عہد گزرے ہیں، پہلا دورخودامام اشعریؒ سے شروع ہوتا ہے،انھوں نے خود ہی اپنی مایہ ناز کلامی کتابیں ’کتاب الابانہ‘اور’مقالات الاسلامیین ‘ لکھ کراپنے نقطہ نظرکوواضح کردیا ہے،یہ دورعلامہ باقلانیؒ(متوفی:۴۰۳ھ) پرختم ہوتاہے،جن کی کتاب ’’التمہید‘‘ ہے۔

اس دور میں مذہب اشعری اعتزال اورفلسفہ دونوں سے دُور رہا،اوراسی لئے اس کو محدثین،فقہاءاورصوفیاء کے درمیان بھی قبولیت حاصل ہوئی،دوسرادور’’التاویل‘‘ کے مصنف ابن فورک اصفہانیؒ(متوفی:۴۰۶ھ) سے شروع ہوتا ہے اورعبدالکریم شہرستانیؒ(متوفی: ۵۴۸ھ) پرختم ہوتاہے،جن کی کتابیں ’نہایۃ الاقدام‘اور’الملل والنحل‘علم کلام کی بڑی اہم کتابیں ہیں۔

اس دور میں جن لوگوں نے مذہب اشاعرہ کوسنوارنے اورترقی دینے کا کام کیا،ان میں امام الحرمینؒ،امام غزالیؒ اورامام فخرالدین رازیؒ کے نام بہت نمایاں ہیں،اس دور میں مذہب اشعری میں تاویل کا رجحان بڑھا،فلسفہ اورمنطق کے بعض افکار سے استفادہ کیا گیا اورمنطق وفلسفہ کے غلبہ کی وجہ سے کلامی بحثوں میں معقولات کالب ولہجہ شامل ہوگیا۔

ماتریدیہ

یہ مذہب امام ابومنصور ماتریدیؒ کی طرف منسوب ہے،ان کا اصل نام محمد بن محمد بن محمود ہے،وہ ماوراءالنہر میں سمرقند کے قریب ’ماترید‘ میں پیدا ہوئے،ان کا سنہ ولادت یقینی طور پر

معلوم نہیں؛ لیکن وفات کا سنہ ۳۲۳ھ یا ۳۳۳ھ بتایا جاتا ہے، انھوں نے اپنے عہد کے اکابر علماء احناف نصر بن یحییٰ بلخیؒ (متوفی: ۲۶۸ھ)، ابونصر عیاضؒ، ابوبکر احمد جوز جانیؒ، ابوسلیمان جوز جانیؒ، محمد بن مقاتل رازیؒ (جو دو واسطوں سے امام ابویوسفؒ اور امام محمدؒ کے شاگرد تھے) وغیرہ سے علم فقہ اور کلام میں استفادہ کیا ہے، انھیں 'امام السنہ' اور 'امام الہدیٰ' کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے، وہ عقائد میں بھی بحیثیت مجموعی امام ابوحنیفہؒ کے متبع تھے۔

علم کلام اور اُصول فقہ میں ان کی بہت سی کتابیں ہیں، کچھ اہم کتابوں کے نام یہ ہیں: بیان وہم المعتزلہ، تاویلات اہل السنہ، الدرر فی اُصول الدین، عقیدۃ الماتریدیہ، کتاب التوحید و اثبات الصفات، کتاب الجدل، مأخذ الشرائع فی اُصول الفقہ، ان کی بنیادی کتاب 'کتاب التوحید' ہے جو ڈاکٹر فتح اللہ خلف کی تحقیق کے ساتھ شائع ہو چکی ہے۔

اشاعرہ اور ماتریدیہ کے درمیان اختلافی مسائل

امام ابومنصور ماتریدیؒ کا سابقہ معتزلہ سے پیش آیا، جیسا کہ امام ابوالحسن الاشعریؒ کے ساتھ ہوا؛ اسی لئے ماتریدیہ اور اشاعرہ کے درمیان بہت زیادہ اختلاف نہیں، اکثر اہل علم نے دس، گیارہ اُصولی اختلافی مسائل کا اور بعض نے اس سے زیادہ کا ذکر کیا ہے، وہ مسائل یہ ہیں:

(۱) انسان پر اپنے رب کی معرفت حاصل کرنا واجب ہے، چاہے ان میں کوئی رسول یا اس کی تعلیم نہیں آئی ہو، اشاعرہ اس کے خلاف ہیں، اشاعرہ کا کہنا ہے کہ شرع کی بنیاد پر ہی اللہ کی معرفت اور اس پر ایمان لانا واجب ہوتا ہے اور ماتریدیہ کے یہاں عقل کی بنا پر بھی ایمان واجب ہے۔

(۲) ماتریدیہ کے نزدیک اللہ کا وہ کلام نہیں سنا جاتا، جو قدیم ہے؛ بلکہ وہ عبارت سنی جاتی ہے، جو اس کلام نفسی قدیم کی ترجمان ہے؛ جب کہ اشاعرہ کے نزدیک بعینہٖ اللہ تعالیٰ کا کلام سنا جاتا ہے۔

(۳) ایمان میں زیادتی اور کمی نہیں ہوتی ہے، جب کہ اشاعرہ ایمان میں کمی اور زیادتی کے قائل ہیں۔

(۴) ماتریدیہ کے نزدیک نبی ہونے کے لئے مرد ہونا شرط ہے، اشاعرہ کے یہاں یہ شرط نہیں ہے۔

(۵) ماتریدیہ کے یہاں اللہ تعالیٰ کی طرف سے تکلیف مالا یطاق نہیں ہوسکتا؛ جب کہ اشاعرہ کے یہاں ہوسکتا ہے، ابواسحاق اشعریؒ اور امام غزالیؒ نے اشعری ہونے کے باوجود اس مسئلہ میں ماتریدیہ کی موافقت کی ہے۔

(۶) ماتریدیہ کے یہاں اللہ تعالیٰ کے افعال حکمت وعلت پر مبنی ہوتے ہیں، جب کہ اشاعرہ کے یہاں یہ ضروری نہیں، ماتریدیہ کہتے ہیں کہ اگر یہ ضروری نہ ہوتو اللہ تعالیٰ کی طرف فعل عبث کی نسبت لازم آئے گی۔

(۷) ماتریدیہ کے یہاں کسی شئے یا فعل میں حسن وقبح کا ادراک عقل کے ذریعہ ہوسکتا ہے؛ لیکن عقل کا ادراک شریعت کے تابع ہوگا، اگراس کا ادراک حکمِ شرعی کے خلاف ہوتو اس کا اعتبار نہیں، اشاعرہ کے نزدیک حسن وقبح کو جاننے میں شریعت ہی کا اعتبار ہے، عقل کا کوئی اعتبار نہیں۔

(۸) جو شخص تقلیدی طور پر ایمان رکھتا ہو، اس کا ایمان معتبر ہے، اشاعرہ کے نزدیک دلیل کے ذریعہ سمجھ کر ایمان لانے والوں کے ہی ایمان کا اعتبار ہوگا۔

(۹) ماتریدیہ کہتے ہیں کہ تمام چیزیں اللہ تعالیٰ کے ارادہ، قضا وقدر اور مشیت سے پیدا ہوتی ہیں؛ البتہ طاعات میں اللہ تعالیٰ کی رضا اور امر شامل ہوتا ہے اور معاصی کے ارتکاب میں اللہ تعالیٰ کی رضا اور امر شامل نہیں ہوتا، جب کہ اشاعرہ کہتے ہیں کہ ان افعال میں بھی اللہ تعالیٰ کی رضا شامل ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ کی رضا سے ہی وہ فعل وجود میں آتا ہے۔

(۱۰) اشاعرہ کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی صفات میں صفات ذاتیہ اور صفات فعلیہ کے درمیان فرق کیا گیا ہے، صفات ذاتیہ قدیم ہیں نہ کہ صفات فعلیہ، ماتریدیہ کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی تمام صفات قدیم اور ازلی ہیں۔

(۱۱) اگرچہ اللہ تعالیٰ کی قدرت میں سب کچھ ہے؛ لیکن ماتریدیہ کا خیال ہے کہ

اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ اور وعید کے خلاف نہیں کرتے ، جب کہ اشاعرہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کر سکتے ہیں۔

(۱۲) ماتریدیہ کے نزدیک اللہ تعالیٰ قبیح افعال کو نہیں کرتے ، جیسے فرمانبردار کو عذاب دینا، انبیاء کو دوزخ میں ڈال دینا، کافروں کو جنت میں رکھ دینا، اشاعرہ کہتے ہیں کہ چوں کہ اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہیں ؛ اس لئے وہ ایسا کر سکتے ہیں ، یہاں تک کہ وہ کافروں کو بھی معاف کر سکتے ہیں۔

(۱۳) ماتریدیہ کے نزدیک اشیاء کو وجود میں آنے یا لانے کے لئے اللہ تعالیٰ 'کن' نہیں کہتے ہیں ، یہ بطور مجاز کے ہے، اور مقصود یہ ہے کہ فوراً ہی اللہ تعالیٰ کے ارادہ کے مطابق چیز وجود میں آجاتی ہے، جب کہ اشاعرہ کے نزدیک یہ حقیقت پر محمول ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کے کلامِ قدیم 'کن' کے تحت چیزیں وجود میں آتی ہیں۔

(۱۴) اگر کوئی شخص مرتد ہوجائے تو اس کے اعمال حبط ہوجائیں گے، اس پر تو دونوں فریقوں کا اتفاق ہے ؛ لیکن پھر وہ تائب ہوجائے تو کیا اس کے نیک اعمال واپس آجائیں گے، اس سلسلہ میں ماتریدیہ کی رائے یہ ہے کہ اس کے اعمال واپس آجائیں گے، اور اس کو ان کا اجر حاصل ہوگا، اشاعرہ کی رائے اس کے خلاف ہے۔

(۱۵) کافروں کو کفر کے علاوہ کیا فرائض و واجبات کے ترک کرنے پر بھی عذاب ہوگا ؟ ماتریدیہ کے نزدیک ترکِ اعمال پر عذاب نہ ہوگا ؛ بلکہ اسے صرف کفر کا عذاب ہوگا ، جب کہ اشاعرہ کفر کے علاوہ ترکِ اعمال کی وجہ سے زائد عذاب دیئے جانے کے قائل ہیں۔

(۱۶) ماتریدیہ کے نزدیک انبیاء کرام کبائر سے بھی معصوم ہیں اور صغائر سے بھی ، یہی نقطۂ نظر علامہ اسفرائینیؒ اور قاضی عیاضؒ کا ہے جو مذہباً اشعری تھے، جب کہ اشاعرہ کے نزدیک انبیاء سے کبائر کا ارتکاب تو نہیں ہوسکتا ؛ لیکن صغائر کا ارتکاب ہوسکتا ہے۔

(۱۷) ماتریدیہ کے نزدیک حالتِ یاس کا ایمان تو مقبول نہیں ہے ؛ لیکن توبہ مقبول ہے، جب کہ اشاعرہ کے نزدیک حالت یاس کی توبہ بھی مقبول نہیں۔

ماتریدیہ اور معتزلہ کے درمیان اختلاف

چوں کہ ماتریدیہ کا مذہب اشاعرہ اور معتزلہ کے درمیان ہے؛ اس لئے ان مسائل کی وضاحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے، جن میں ماتریدیہ کا نقطۂ نظر معتزلہ سے مختلف ہے، اور وہ یہ ہیں :

(۱) اس میں اختلاف ہے کہ ایمانیات کے جاننے کا ذریعہ عقل ہے یا نقل، یعنی کتاب وسنت؟ معتزلہ کہتے ہیں کہ اس کا ذریعہ عقل ہے، اشاعرہ کہتے ہیں کہ نقل ہے، ماتریدیہ نے درمیانی راستہ اختیار کیا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات اور نبوت ورسالت کی معرفت عقل سے ہے اور آخرت کی تفصیلات کو جاننے کا ذریعہ نقل ہے۔

(۲) معتزلہ بھی اسمائے الٰہی کے قائل ہیں؛ لیکن وہ کہتے ہیں کہ یہ اسماء صفات پر دلالت نہیں کرتے، ذات پر دلالت کرتے ہیں، جب کہ ماتریدیہ کے نزدیک یہ صفات پر بھی دلالت کرتے ہیں۔

(۳) معتزلہ اللہ تعالیٰ کے لئے صفات کا انکار کرتے ہیں؛ جب کہ ماتریدیہ اللہ تعالیٰ کے لئے ۸ صفات ذاتیہ، علم، حیات، قدرت، ارادہ، سمع، بصر، کلام، اور تکوین کو ثابت کرتے ہیں۔

(۴) معتزلہ کے نزدیک قرآن مجید ازلی نہیں ہے، جب کہ ماتریدیہ کے نزدیک اللہ تعالیٰ کا کلام نفسی قدیم، ازلی اور غیر مخلوق ہے۔

(۵) معتزلہ کے نزدیک انسان اپنے افعال کا خود خالق ہے، جب کہ ماتریدیہ کے نزدیک افعال کا خَلق اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے اور کسب بندہ کی طرف سے۔

(۶) رویت باری کے معتزلہ قائل نہیں، ماتریدیہ اس کے قائل ہیں۔

(۷) جنت دوزخ معتزلہ کے نزدیک نہ ابھی پیدا ہوئی ہیں اور نہ ابھی موجود ہیں؛ بلکہ قیامت میں پیدا کی جائیں گی، ماتریدیہ کے نزدیک وہ پیدا ہو چکی ہیں۔

(۸) معتزلہ عذاب قبر، میزان، پل صراط اور اہل کبائر کے لئے شفاعت کے قائل نہیں، ماتریدیہ ان سب کے قائل ہیں۔

(۹) معتزلہ کرامات اولیاء کے قائل نہیں، ماتریدیہ قائل ہیں۔

(۱۰) معتزلہ کے نزدیک ایمان تصدیق، اقرار اور عمل کا نام ہے، ماتریدیہ کے نزدیک اصل ایمان تصدیق بالقلب ہے۔

(۱۱) معتزلہ کے نزدیک مرتکب کبیرہ دنیا میں کفر وایمان کے درمیان ہے اور آخرت میں اس کی جگہ دوزخ ہے، جب کہ ماتریدیہ کے نزدیک وہ مومن ہے۔

(۱۲) معتزلہ کے نزدیک مقلد کا ایمان معتبر نہیں، جب کہ ماتریدیہ کے نزدیک مقلد کا ایمان درست ہے؛ لیکن دلیل سے واقف نہ ہونا اس کی کوتاہی ہے۔

(۱۳) معتزلہ کے نزدیک ایمان میں کمی وزیادتی ہوتی ہے، جب کہ ماتریدیہ کے نزدیک ایمان میں کمی وزیادتی نہیں ہوتی؛ اس لئے کہ اعمال ان کے نزدیک ایمان کا جزء نہیں ہیں۔

جن مسائل میں ماتریدیہ اور معتزلہ کا اتفاق ہے

ماتریدیہ جن باتوں میں معتزلہ کی موافقت کرتے ہیں، ان میں سے چند اہم اُمور یہ ہیں :

(۱) عقل وفہم کا استعمال کر کے اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرنے اور ایمان لانے کا واجب ہونا، چاہے شارع کی نص انسان تک نہ پہنچی ہو۔

(۲) یہ نقطۂ نظر کہ اللہ تعالیٰ کا ہر فعل کسی نہ کسی حکمت اور علت پر مبنی ہوتا ہے۔

(۳) کسی چیز کے حسن وقبح کو معلوم کرنے کا ایک ذریعہ عقل بھی ہے؛ البتہ معتزلہ کے یہاں عقل کی حیثیت حاکم کی ہے اور ماتریدیہ کے نزدیک وہ حکم الٰہی کے تابع ہے۔

(۴) یہ بات کہ اللہ تعالیٰ ان چیزوں کا مکلف نہیں بناتے جو طاقت سے باہر ہوں۔

(۵) عقائد میں تنہا خبر واحد کا معتبر نہیں ہونا؛ کیوں کہ خبر واحد ظنی الثبوت ہے اور عقائد کا تعلق ایمان وکفر سے ہے؛ اس لئے اس میں یقینی دلیل ہونی چاہئے۔

ماتریدیہ اور اہلِ سنت کے دوسرے مسالک

اہل سنت والجماعت کے دوسرے مکاتب اور ماتریدیہ کے طرزِ فکر میں جو فرق ہے، ان میں بعض تو وہی ہیں جن میں ماتریدیہ نے معتزلہ کی موافقت کی ہے، یعنی عقل کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی معرفت کا ممکن ہونا اور ایمان کا واجب ہونا، حسن وقبح کا ایک ذریعہ عقل کو قرار دینا؛ لیکن اس کے علاوہ اُصولی بات یہ ہے کہ ماتریدیہ تاویل اور تفویض دونوں کے قائل ہیں اور تاویل کے قائل ہونے کی بنیاد پر وہ قرآن وحدیث کے الفاظ میں بعض جگہ معنی حقیقی کے بجائے معنی مجازی مراد لینے کو درست سمجھتے ہیں؛ اسی لئے ان کے یہاں تاویل معتزلہ سے کم اور اشاعرہ سے زیادہ ہے؛ کیوں کہ ان کا نقطہ نظر یہ ہے کہ قرآن وحدیث میں بہت سے الفاظ وہ ہیں جن میں تاویل کے بغیر چارہ کار نہیں، مثلاً: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''نَنۡسٰكُمۡ كَمَا نَسِيۡتُمۡ لِقَآءَ يَوۡمِكُمۡ هٰذَا'' (جاثیہ:۳۴) اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف بھولنے کی نسبت ہے، ظاہر ہے کہ اس کی تاویل کرنی ہوگی، یا جیسے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: 'ابن آدم کا قلب اللہ تعالیٰ کی انگلیوں میں سے دو انگلی کے درمیان ہے' تو کیا اس کو معنی حقیقی پر محمول کیا جائے گا کہ انسان کے جسم میں قلب کے دونوں طرف اللہ تعالیٰ کی دو انگلیاں ہیں؟ ظاہر ہے کہ اس کا معنی یہی ہوسکتا ہے کہ انسان کا دل اللہ تعالیٰ کے ارادہ اور قدرت میں ہے کہ وہ جس طرف چاہے اسے پھیر دے۔

حقیقت یہ ہے کہ ماتریدیہ کا مذہب عقل ونقل دونوں سے ہم آہنگ ہے، اور وہ ایمانیات کی ایسی تشریح کرتا ہے جو کتاب وسنت سے متصادم بھی نہیں اور عقل سے ہم آہنگ بھی ہے؛ اسی لئے بعض اہل علم نے لکھا ہے کہ اہل سنت والجماعت میں ماتریدیہ کا موقف سب سے زیادہ اسلامی روح کے مطابق ہے، اس مکتبہ فکر کی پیدائش تو ماوراء النہر کے علاقہ میں ہوئی؛ لیکن خلافت عثمانیہ کے اس کو اختیار کرلینے کی وجہ سے یہ اشاعرہ کے بعد سب سے بڑا اعتقادی مذہب بن گیا، ماضی قریب میں خضری بکؒ، طاش کبری زادہؒ (متوفی: ۱۳۱۷ھ)، علامہ احمد

بن حسن بیاضیؒ (متوفی: ۱۰۹۸ھ)، علامہ زاہد الکوثریؒ (متوفی: ۱۳۷۱ھ)، اور مصطفیٰ صبریؒ (متوفی: ۱۳۷۳ھ) جیسے علماء کے اس کلامی مذہب سے وابستہ ہونے کی وجہ سے اس کو ایک نئی قوت حاصل ہوئی۔

حنابلہ

امام احمد بن حنبلؒ ائمہ متبوعین میں سے ایک ہیں، امام احمد بن حنبلؒ جہاں ایک بڑے محدث اور فقیہ تھے، وہیں انھوں نے اپنے زمانہ میں اہل سنت والجماعت کے خلاف اُٹھنے والے افکار کا مقابلہ بھی کیا، خاص کر معتزلہ جن کو اس وقت سیاسی پشت پناہی حاصل تھی، کے خلاف انھوں نے بہت جرأت کے ساتھ اہل سنت کے نقطہ نظر کو پیش کیا، عام طور پر ان کا طرز فکر اور اُسلوب استدلال وہی تھا، جو امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ اور امام شافعیؒ یا دوسرے علماء کا ہے؛ چوں کہ ان کا سابقہ معتزلہ سے تھا اور معتزلہ نقل کے مقابلہ عقل کو زیادہ اہمیت دیتے تھے، اور اس کی وجہ سے بہت سی نصوص کی دوراز کار تاویل کرتے تھے؛ اس لئے انھوں نے عقل کے بجائے نقل کو اصل بنانے کی دعوت دی۔

امام احمد بن حنبلؒ کا اسم گرامی احمد، والد کا نام محمد، دادا کا حنبل اور کنیت ابوعبداللہ تھی، ماں باپ دونوں کی طرف سے آپ کا نسب عرب کے قبیلہ ربیعہ کی شاخ شیبان سے ملتا ہے؛ اس لئے آپ شیبانی کہلاتے ہیں، آباء واجداد، مرو میں رہتے تھے، وہاں سے بغداد آئے، اور بغداد میں ہی ربیع الاول ۱۶۴ھ میں پیدا ہوئے، کوفہ، بصرہ، مکہ، مدینہ، شام اور یمن کے اسفار طلبِ علم کے لئے کئے، امام شافعیؒ، سفیان بن عیینہؒ وغیرہ، آپ کے اساتذہ میں ہیں، امام بخاری، امام مسلم جیسے اساطین علم نے آپ سے روایت لی ہے، حدیث وفقہ دونوں میں آپ کو نمایاں درجہ حاصل ہے، جہاں علم کی دنیا میں آپ کی خدمات کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، وہیں دعوت وعزیمت اور حق پر استقامت کی تاریخ میں بھی آپ کی حیات نقش جاوداں کی حیثیت رکھتی ہے کہ ۲۱۸ھ تا ۲۲۳ھ میں آپ کو عباسی خلفاء (مامون، معتصم اور واثق) کی طرف سے سخت ابتلاؤں اور آزمائشوں سے گزرنا پڑا اور اس کوچۂ امتحان کی آبلہ پائی میں کہیں

آپ کے قدم میں تزلزل پیدا نہیں ہوا، ۱۴۲ھ میں ماہ ربیع الاول ۱۴۲ھ ہی میں آپ کی وفات ہوئی۔

اس پر تمام اہل سنت کا اتفاق ہے کہ نصوص کو عقل پر تقدم حاصل ہے؛ لیکن امام احمدؒ کی اس فکر کو سمجھنے میں آگے چل کر ان لوگوں کی فکر یکساں نہیں رہی، جو اپنے آپ کو ان کی جانب منسوب کیا کرتے تھے؛ چنانچہ امام احمدؒ کی جانب اپنے آپ کو منسوب کرنے والوں میں تین قسم کے گروہ ہو گئے۔

(۱) وہ لوگ جن کا کلامی بحثوں میں عقلی دلائل کی طرف زیادہ جھکاؤ ہو گیا، انھوں نے اشاعرہ بلکہ بعض دفعہ معتزلہ کی آراء کو بھی اختیار کیا، جیسے حنابلہ بغداد کے شیخ ابن عقیلؒ، 'المعتمد' کے مصنف ابویعلیؒ، ابن الجوزیؒ، جو عقائد میں مختلف کتابوں کے مولف ہیں وغیرہ، یہاں تک کہ ابن عقیل کو تو بعضوں نے ان کے اس رجحان کی وجہ سے اہل سنت والجماعت سے خارج قرار دیا ہے۔

(۲) دوسرا گروہ وہ تھا جس نے ظاہر نص کے التزام میں غلو اور تشدد سے کام لیا، جیسے اللہ تعالیٰ کے لئے جہت کے مسئلہ میں، اسی طرح انھوں نے اللہ تعالیٰ کے لئے ''وجہ، ید وغیرہ'' کے الفاظ کی ایسی تشریح کی، جو حشویہ اور مجسمہ کے قریب پہنچ گئی، علامہ نسفیؒ ان حضرات کا 'متقشفہ' کے لفظ سے ذکر کرتے ہیں۔

(۳) تیسرا گروہ ان دونوں کے درمیان ہے جو نص کو پوری اہمیت دیتا ہے اور عقل کو بھی معطل قرار نہیں دیتا، اس گروہ کی ترجمانی ابن الزعفرانیؒ، ابن قدامہؒ کرتے ہیں، اور اس کے سب سے بڑے نمائندہ علامہ ابن تیمیہؒ ہیں۔

ماضی قریب میں شیخ محمد بن عبد الوہابؒ نے نجد وحجاز میں جو تحریک شروع کی، اس تحریک کی نسبت بھی امام احمد بن حنبلؒ کی طرف کی جاتی ہے؛ چوں کہ اشاعرہ اور ماتریدیہ کا مذہب پورے عالم اسلام پر حاوی رہا؛ اس لئے ایک کلامی مذہب کی حیثیت سے مذہب 'حنبلی' کو زیادہ فروغ حاصل نہ ہو سکا؛ لیکن موجودہ دور میں چوں کہ سعودی حکومت نے اس مذہب کو

اختیار کرلیا ہے اور سرکاری طور پر اس کی تبلیغ واشاعت ہوتی ہے؛ اس لئے اس کلامی دبستان فکر کا حلقہ بھی وسعت اختیار کر رہا ہے، خاص کر خلیجی ملکوں میں اب بڑی تعداد کا یہی مذہب ہے۔

اشاعرہ وماتریدیہ اور حنابلہ کے درمیان اختلاف

حنابلہ اور اشاعرہ و ماتریدیہ کے درمیان جو اختلافات پائے جاتے ہیں، ان میں سے چند اہم نکات یہ ہیں :

(۱) اشاعرہ اور ماتریدیہ کے نزدیک ایمان 'تصدیق قلبی' کا نام ہے، اقرار باللسان اور عمل بالارکان ایمان کا جزء نہیں ہے؛ بلکہ ایمان کے آثار میں سے ہیں؛ لیکن حنابلہ کے نزدیک ایمان تصدیق، اقرار اور عمل کے مجموعہ کا نام ہے؛ تاہم اس پر ان کا بھی اتفاق ہے کہ قول یا عمل کے فوت ہونے کی وجہ سے انسان دائرہ ایمان سے باہر نہیں نکل جاتا۔

(۲) اللہ تعالیٰ کی معرفت کا ایک اہم ذریعہ ماتریدیہ کے نزدیک عقل ہے اور اشاعرہ میں بھی امام الحرمین علامہ عبدالملک جوینیؒ، امام فخر الدین رازیؒ، امام غزالیؒ اور علامہ سیف الدین آمدیؒ وغیرہ اسی کے قائل ہیں، حنابلہ کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی معرفت میں عقل کا کوئی دخل نہیں ہے۔

(۳) اشاعرہ اللہ تعالیٰ کے لئے سات صفات ذاتیہ کے قائل ہیں، ماتریدیہ نے اس پر ایک آٹھویں صفت تکوین کا اضافہ کیا ہے، اور دوسری صفات استواء، علو، نزول وغیرہ کی تاویل کرتے ہیں؛ لیکن حنابلہ کے نزدیک یہ صفات بھی اپنے حقیقی معنی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے لئے ثابت ہیں۔

(۴) قرآن مجید تمام اہل سنت کے یہاں غیر مخلوق ہے؛ لیکن اس سے مراد اشاعرہ اور ماتریدیہ کے نزدیک کلام نفسی ہے، اس کی ترجمانی کرنے والے حروف و اصوات اشاعرہ و ماتریدیہ کے نزدیک قدیم نہیں ہیں؛ لیکن حنابلہ کے نزدیک یہ بھی قدیم ہیں، اور اللہ کے کلام کو سننے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے الفاظ وحروف کو براہ راست فرشتے سنتے ہیں، حضرت جبرئیل علیہ السلام نے سنا ہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی اس کی سماعت کی ہے۔

(۵) اشاعرہ اور ماتریدیہ بندوں کے افعال کا خالق اللہ کو مانتے ہیں؛ لیکن کہتے ہیں کہ انسان کو ارادہ کی قدرت دی گئی ہے اور اسی کا نام کسب ہے اور اسی کی وجہ سے ثواب وعقاب ہے؛ لیکن حنابلہ کہتے ہیں کہ یہ ارادہ بھی اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے۔

(٦) اشاعرہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انسان کو ایسی چیز کا مکلف کر سکتے ہیں جو اس کی طاقت سے زیادہ ہو، حنابلہ کے نزدیک یہ درست نہیں ہے؛ کیوں کہ قرآن میں صاف کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی انسان کو 'تکلیف مالا یطاق' کا مکلف نہیں کرتے۔

(۷) اشاعرہ کہتے ہیں کہ حسن وقبح کو عقل سے نہیں جانا جاسکتا، نقل ہی سے جانا جاسکتا ہے؛ حنابلہ اس کو غلط قرار دیتے ہیں کہ یہ گویا اس بات کو تسلیم کرنا ہوا کہ اللہ تعالیٰ ایسی باتوں کا بھی حکم دیتے ہیں جو عقل کے اعتبار سے قبیح ہے۔

(۸) اشاعرہ کے نزدیک اسباب کا مسببات کے پائے جانے میں کوئی اثر نہیں ہے، مثلاً: آگ میں جلانے کی تاثیر نہیں ہے؛ بلکہ جب لکڑی کے ساتھ آگ کا اتصال ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جلانے کا حکم ہوتا ہے، اس کی وجہ سے لکڑی جلتی ہے، حنابلہ کہتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے؛ بلکہ اللہ تعالیٰ نے ہی سبب اور مسبب کو پیدا کیا ہے، جب سبب کا تحقق ہوگا تو مسبب کا تحقق ہوگا، یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے منافی نہیں ہے۔

(۹) اشاعرہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے افعال کا حکمت وعلت پر مبنی ہونا اللہ تعالیٰ پر لازم نہیں ہے، حنابلہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے تمام افعال حکمت پر مبنی ہیں۔

(۱۰) رویت باری کے قائل تو اشاعرہ بھی ہیں اور ماتریدیہ بھی؛ لیکن وہ رویت جہت اور مقابلہ سے منزہ ہوگی، یعنی جیسے عام طور پر جن اشیاء کو دیکھا جاتا ہے، وہ ایک مقررہ جہت میں ہوتی ہیں اور اس کا وجود دیکھنے والے کے مقابل ہوتا ہے، ایسا نہیں ہوگا؛ لیکن حنابلہ کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی رویت جہت اور مقابلہ کے ساتھ ہوگی۔

اگرچہ کہ اشاعرہ، ماتریدیہ اور حنابلہ کے درمیان بہت سے مسائل میں اختلاف رائے نظر آتا ہے؛ لیکن نتیجہ کے اعتبار سے یہ اختلاف اتنا شدید نہیں ہے جیسا کہ پیش کیا جاتا ہے،

بالخصوص آج کل اشاعرہ اور حنابلہ کے درمیان جس قسم کی آویزش پیدا ہوگئی ہے، وہ بے محل معلوم ہوتی ہے، حقیقت یہ ہے کہ یہ تینوں کلامی فرقے اہل سنت والجماعت میں داخل ہیں۔

آج کل حنابلہ کے یہاں ان کے مذہب کی ترجمان کی حیثیت سے جو کتاب سب سے زیادہ مقبول ہے اور اہل علم کا مرجع ہے وہ امام ابوجعفر احمد بن محمد الطحاوی حنفیؒ (مولود: ۲۳۹ھ، متوفی: ۳۲۲ھ) کی تالیف ''عقیدۃ الطحاوی'' اور قاضی ابوالحسن علی بن علاء الدین ابن العز دمشقی حنفیؒ کے قلم سے اس کی شرح ہے، یہی متن وشرح موجودہ خلیجی ممالک میں عقیدہ کی کتاب کی حیثیت سے سب سے زیادہ معتبر مانی جاتی ہے۔

تمرینی سوالات

(۱) اہل سنت والجماعت کے اعتقادی مسالک کیا کیا ہیں؟

(۲) امام ابوالحسن اشعریؒ کے مذہب معتزلہ کو چھوڑنے کا کون سا واقعہ ہوا؟

(۳) مسلکِ اشعری کو کن علماء کے ذریعہ فروغ حاصل ہوا؟

(۴) امام ابوالحسن اشعریؒ نے توحید، عدل، اعمالِ صالحہ، اللہ تعالیٰ پر اعمال کے اعتبار سے ثواب وعذاب کا وجوب اور فاسق حکمرانوں کے خلاف بغاوت کے سلسلے میں معتزلہ کے مقابلہ کیا متعدل رائے اختیار کی ہے؟

(۵) رویت باری تعالیٰ کے اور معجزات کے سلسلے میں معتزلہ اور اہل سنت کے درمیان کیا اختلاف ہے؟

(۶) صفاتِ باری تعالیٰ کے بارے میں اشاعرہ اور معتزلہ کا کیا اختلاف ہے؟

(۷) اشاعرہ اور معتزلہ کے درمیان جن مسائل میں اختلاف پایا جاتا ہے، ان میں سے چند کا ذکر کیجئے؟

(۸) مسلکِ ماتریدیہ کے مؤسس کون ہیں؟ نیز اس مسلک کی چند اہم شخصیتوں کے نام لکھئے؟

(۹) اشاعرہ اور ماتریدیہ کے درمیان جن اُمور میں اختلاف ہے، ان میں سے پانچ اُمور ذکر کیجئے؟

(۱۰) ماتریدیہ اور معتزلہ کے درمیان جن اُمور میں اختلاف ہے، ان پر اختصار کے ساتھ روشنی ڈالئے؟

(۱۱) تفویض اور تاویل سے کیا مراد ہے؟ اور اس سلسلے میں ماتریدیہ کا نقطۂ نظر کیا ہے؟

(۱۲) کس مسئلہ کی وجہ سے عہد عباسی میں امام احمدؒ کو ابتلاء و آزمائش سے گزرنا پڑا؟

(۱۳) موجودہ دور میں اعتقادی اعتبار سے بعض علاقوں میں مسلکِ حنبلی کو کیوں فروغ حاصل ہوا؟

(۱۴) حنابلہ کا اشاعرہ اور ماتریدیہ سے جن مسائل میں اختلاف رہا ہے، ان میں سے پانچ کا ذکر کیجئے؟

(۱۵) آج کل کونسی کتاب مسلکِ حنبلی کی ترجمان سمجھی جاتی ہے؟



چھٹا باب
اہلِ سنت والجماعت کے عقائد

ایمان کی حقیقت

ایمان ان تمام اُمور کو دل سے ماننے کو کہتے ہیں جن کا جزوِ دین ہونا دلیل قطعی سے ثابت ہو، جو بات اجمالی طور پر ثابت ہو، ان کو اجمالی طور پر تسلیم کرنا، اور جو بات تفصیل کے ساتھ ثابت ہو، ان کو تفصیل کے ساتھ ماننا ضروری ہے؛ چنانچہ علامہ آلوسیؒ فرماتے ہیں :

وأما فی الشرع فهو : التصديق بما علم مجئی النبی صلی الله علیه وسلم ضرورة ، تفصیلاً فیما علم تفصیلاً ، و إجمالا فیما علم إجمالاً ، وهذا مذهب جمهور المحققین ۔ (۱)

دلیل قطعی سے یہ مراد ہے کہ وہ قرآن یا حدیث متواتر سے ثابت ہو، اور اپنے معنی پر اس کی دلالت واضح ہو، جیسے: نماز، روزہ، حج وزکوٰۃ کی فرضیت، سود وشراب کی حرمت، ختم نبوت وغیرہ :

والمراد حصول العلم الضروری بثبوته عن النبی صلی الله علیه وسلم لا کون الثابت ضروریاً ، وهذا العلم إنما یحصل بالتواتر ۔ (۲)

تصدیق

یہ بات کہ ''ایمان دل سے تسلیم کرنے یعنی تصدیق قلبی کا نام ہے'' کی بہت سی دلیلیں ہیں، جن میں چند یہ ہیں :

---

(۱) روح المعانی: ۱/ ۱۱۳۔ (۲) فتح الملہم: ۱/ ۴۰۵۔

۱- اللہ تعالیٰ نے ایمان کی نسبت قلب کی طرف کی ہے اور قلب تصدیق ہی کا محل ہے نہ کہ اقرار اور عمل صالح کا؛ کہ اقرار کا محل زبان ہے، اور افعال کا محل اعضاء و جوارح ہیں؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

أُولَٰئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ ـ (۱)

مِنَ الَّذِينَ قَالُوا آمَنَّا بِأَفْوَاهِهِمْ وَلَمْ تُؤْمِن قُلُوبُهُمْ ـ (۲)

۲- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''**يخرج من النار من كان في قلبه مثقال ذرة من الإيمان**''۔(۳)

۳- حدیث جبرئیل (۴) جس میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان چیزوں کو ایمان میں شامل فرمایا ہے، جن کا تعلق دل کے یقین سے ہے۔

اقرار باللسان

اگر چہ ایمان قلب کی تصدیق کا نام ہے؛ لیکن جن باتوں پر ایمان لانا ضروری ہے، ان کا اقرار کرنے کی بھی بڑی اہمیت ہے؛ لہٰذا :

☆ اگر کوئی شخص اقرار تو کرے؛ لیکن دل اس پر مطمئن نہیں ہو تو آخرت کی نجات کے اعتبار سے وہ مومن شمار نہیں ہوگا، کافر ہوگا، اور اگر اسی حالت میں اس کی موت ہوگئی تو اس کا ٹھکانہ ہمیشہ کے لئے دوزخ ہوگا۔

☆ لیکن دنیا میں اس پر وہی احکام جاری ہوں گے، جو مسلمانوں کے ہیں، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں منافقین تھے۔

☆ اقرار باللسان عام حالات میں تو واجب نہیں ہے؛ لیکن عند الطلب واجب ہے؛ چنانچہ علامہ ابن ہمامؒ فرماتے ہیں :

---

(۱) سورہ مجادلہ: ۲۲۔ (۲) سورہ مائدہ: ۴۱۔

(۳) سنن ترمذی، باب ماجاء فی الکبر، حدیث نمبر: ۱۹۹۹۔

(۴) صحیح البخاری، باب سوال جبریل النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، حدیث نمبر: ۵۰۔

... أن أهل القول الأول اتفقوا على أنه يلزم أن يعتقد أنه متى طلب منه الإقرار أتى به ، فإن طولب ولم يقر فهو كفر عناد ۔ (۱)

☆ اگر کوئی شخص ارکان ایمان کی تصدیق کرتا ہو؛ لیکن اس نے زبان سے اقرار نہیں کیا ہوتو وہ مومن ہی ہوگا :

قال بعضهم : الإقرار باللسان شرط الإيمان فی حق إجراء الأحكام فقط ، حتى إن من صدق الرسول صلی الله عليه وسلم فی جميع ما جاء به من عند الله تعالیٰ فهو مؤمن فيما بينه وبين الله تعالیٰ ، وإن لم يقر بلسانه ، وقال حافظ الدين النسفی : هو المروی عن أبی حنيفة ، و إليه ذهب الأشعری فی أصح الروايتين ، وهو قول أبی منصور الماتريدی ۔ (۲)

معرفت

☆ اگر کسی شخص کو اُمور ایمان کی معرفت تو ہو، وہ اپنی عقل اور تجربہ کی بنا پر اس کو درست سمجھتا ہو؛ لیکن تسلیم نہیں کرتا ہو، تو یہ معرفت ایمان کے لئے کافی نہیں ہے، جیسا کہ اہل مکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نبی برحق ہونے کو جانتے تھے؛ لیکن مانتے نہیں تھے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا ۔ (۳)

اسی طرح اہل کتاب آپ کے نبی ہونے کو اچھی طرح جانتے تھے ؛ لیکن تسلیم نہیں کرتے تھے :

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ۔ (۴)

(۱) روح المعانی: ۱/ ۱۱۴۔
(۲) فتح الملہم: ۱/ ۴۱۱۔
(۳) نمل: ۱۴۔
(۴) بقرہ: ۱۴۶۔

لہٰذا صرف معرفت کا حاصل ہونا مومن ہونے کے لئے کافی نہیں ہے؛ بلکہ تصدیق وتسلیم ضروری ہے؛ کیوں کہ معرفت ایک غیر اختیاری کیفیت ہے اور تصدیق قلب کا اختیاری فعل، اور ایمان لانے میں اختیار مطلوب ہے، علامہ زبیدیؒ فرماتے ہیں :

التصديق لغة هو : نسبة الصدق إلى القائل وهو فعل ، والمعرفة ليست فعلاً ، إنما هو من قبيل الكيف ۔ (۱)

اعمالِ صالحہ

ایمان سے متعلق تیسری اہم چیز ہے: عمل، یہ ایمان کا جزو نہیں ہے؛ اس لئے کہ :

- ایمان کا محل قلب ہے (جیسا کہ اوپر مذکور ہوا) اور عمل صالح کا محل اعضاء وجوارح ہیں۔
- قرآن مجید میں متعدد مواقع پر عمل صالح کا ایمان پر عطف کیا گیا ہے، مثلاً :

اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۔ (التین:۶)

اور معطوف اور معطوف علیہ کے درمیان مغائرت ہوتی ہے۔

- قرآن مجید میں عمل صالح کے لئے ایمان کو شرط قرار دیا گیا ہے :

وَ مَنْ یَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَ هُوَ مُؤْمِنٌ ۔ (طٰہٰ:۱۱۲)

اور شرط ومشروط میں مغائرت ہوتی ہے۔

البتہ اعمالِ صالحہ کی بھی بڑی اہمیت ہے، یہ ایمان کے ثمرات ہیں، قرآن وحدیث میں جہاں کہیں عمل پر ایمان کا اطلاق کیا گیا ہے، وہاں ثمرۂ ایمان مراد ہے، اگر تصدیق نہ ہو تو انسان آخرت میں ہمیشہ کے لئے دوزخ میں ڈالا جائے گا، اور تصدیق ہو؛ لیکن عمل صالح مفقود ہو، یا اس میں کمی ہو اور اللہ تعالیٰ معاف نہ کریں تو وہ بھی دوزخ میں ڈالا جائے گا، مگر ہمیشہ کے لئے نہیں۔

---

(۱) اتحاف السادۃ المتقین: ۲/ ۲۴۸۔

ایمان اور اسلام

''ایمان'' سے قریب دوسری تعبیر ''اسلام'' ہے، ایمان نام ہے تصدیق کا، اور اسلام کہتے ہیں استسلام یعنی اطاعت وفرمانبرداری کو؛ چنانچہ امام غزالیؒ فرماتے ہیں :

والحق فيه أن الإيمان عبارة عن التصديق ...
والإسلام عبارة عن التسليم والاستسلام بالإذعان
والانقياد الخ ۔ (۱)

نیز علامہ بزودیؒ فرماتے ہیں :

الإيمان هو التصديق والإسلام هو الانقياد ۔ (۲)

چنانچہ جب رسول اللہ ﷺ سے اسلام کی حقیقت دریافت کی گئی تو آپ نے فرمایا :

الإسلام أن تعبد الله ولا تشرك به ، وتقيم الصلاة ،
وتؤدي الزكاة المفروضة وتصوم رمضان ۔ (۳)

جو منافقین ظاہری طور پر مومن ہونے کا اقرار کرتے تھے؛ لیکن حقیقت میں صاحبِ ایمان نہیں ہوتے تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں فرمایا :

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا
وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ۔ (حجرات:۱۴)

لیکن چوں کہ ایمان ویقین کا اثر اطاعت وانقیاد کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، جس کے دل میں ایمان ہوتا ہے، اس کے اندر اطاعت ہوتی ہے، اور جو اللہ اور اس کے رسول کا مطیع وفرمانبردار ہوتا ہے، اس میں ایمان ویقین ہوتا ہے؛ اس لئے بعض دفعہ ایمان کی جگہ اسلام یا اسلام کی جگہ ایمان کا لفظ استعمال ہوتا ہے اور قرآن وحدیث میں اس کی مثالیں موجود ہیں۔

---

(۱) قواعد العقائد للغزالی: ۲۳۶۔

(۲) أصول الدین: ۵۴۔

(۳) بخاری، کتاب الایمان، باب سوال جبرئیل الخ، حدیث نمبر: ۵۰۔

یوں تو دین کے تمام عملی احکام اسلام میں شامل ہیں؛ چاہے ان کا تعلق عبادات سے ہو یا معاملات سے، اور معاشرت سے ہو یا اخلاق سے، مگر اس کے چار بنیادی ارکان ہیں: نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ۔

کفر

کفر کے معنی انکار کے ہیں، جن باتوں کا بالضرورۃ دین میں سے ہونا ثابت ہو، ان میں سے کسی بات کا انکار کرنا کفر ہے، اس سلسلہ میں دو باتیں اہم ہیں:

(الف) مومن ہونے کے لئے تو ان تمام باتوں کو تسلیم کرنا ضروری ہے، جو ثابت ہوں؛ لیکن کافر قرار پانے کے لئے تمام باتوں کا انکار ضروری نہیں ہے، اگر تمام باتوں کو مانتا ہو اور ایک کا بھی انکار کر دے تو وہ کافر ہو جائے گا؛ اسی لئے حضرت ابوبکر صدیقؓ نے مانعین زکوٰۃ سے جہاد فرمایا تھا؛(۱) حالاں کہ وہ دوسرے ارکان اسلام کے منکر نہیں تھے۔

(ب) اگر کوئی شخص زبان سے ایمان کا اقرار کرتا ہو؛ لیکن عملی طور پر کفر کا مرتکب ہو تو وہ بھی کافر ہوگا، جیسے: کلمۂ توحید پڑھتا ہو اور بت پرستی بھی کرتا ہو۔

ارکان ایمان

یوں تو ان تمام باتوں کو تسلیم کرنا ایمان میں شامل ہے، جو دلیل قطعی سے ثابت ہوں؛ لیکن اس کے چھ بنیادی ارکان ہیں:

(۱) اللہ پر ایمان۔

(۲) رسول پر ایمان۔

(۳) آسمانی کتابوں پر ایمان۔

(۴) ملائکہ پر ایمان۔

(۵) آخرت پر ایمان۔

(۶) تقدیر پر ایمان۔

---

(۱) صحیح البخاری، باب اخذ العناق فی الصدقۃ، حدیث نمبر:۱۴۵۶۔

قرآن وحدیث میں ان اُمورستہ کا خاص طور پر ذکرفرمایا گیاہے؛ چنانچہ ارشاد ہے :

وَ لٰکِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ الْمَلٰٓئِکَۃِ وَالْکِتٰبِ وَ النَّبِیّٖنَ ۔ (بقرہ:۱۷۷)

اسی طرح کفر کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا :

وَ مَنْ یَّکْفُرْ بِاللّٰہِ وَ مَلٰٓئِکَتِہٖ وَ کُتُبِہٖ وَ رُسُلِہٖ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِیْدًا ۔ (نساء:۱۳۶)

آخری رکن تقدیر کا ذکر دوسری آیات میں آیا ہے :

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَۃٍ فِی الْاَرْضِ وَ لَا فِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَھَا ۔ (حدید:۲۲)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اِن چھ ارکان کا ایک ساتھ ذکر فرمایا ہے :

الإیمان أن تؤمن باللّٰہ وملائکتہ وکتبہ ورسلہ والیوم الآخر وتؤمن بالقدر خیرہ وشرہ من اللہ تعالٰی ۔ (۱)

تمرینی سوالات

(۱) ایمان کی تعریف کیجئے؟

(۲) دلیل قطعی سے کیا مراد ہے؟

(۳) ایمان تصدیق قلبی کا نام ہے، قرآن وحدیث سے اس کی دلیل پیش کیجئے؟

(۴) اقرار کب واجب ہے؟

(۵) عمل ایمان کا جزء نہیں ہے، اس کی کیا دلیل ہے؟

(۶) ایمان اور اسلام ایک ہی ہے یا الگ الگ، وضاحت کیجئے۔

(۷) کفر کسے کہتے ہیں؟

(۸) ایمان کے چھ بنیادی ارکان کیا ہیں؟

---

(۱) بخاری عن ابی ہریرہ، حدیث نمبر: ۵۰۔

اللہ تعالیٰ پر ایمان

اللہ تعالیٰ پر ایمان تین باتوں کو شامل ہے :

(۱) وجود باری۔

(۲) توحید۔

(۳) صفات باری۔

وجود باری

وجود باری سے اس بات کا یقین رکھنا مراد ہے کہ اگرچہ ہم اللہ کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھتے ہیں؛ لیکن وہ موجود ہے، اسی نے پوری کائنات کو پیدا کیا ہے اور اسی کے حکم سے اس کا نظام جاری وساری ہے۔

دلیلیں

اس کائنات کا ذرہ ذرہ اللہ کے وجود کی دلیل ہے؛ لیکن چند اہم دلیلیں یہ ہیں :

(الف) ہم دن ورات اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ کوئی چیز بنانے والے کے بغیر وجود میں نہیں آتی، سوئی سے لے کر جہاز تک ہر چیز کسی صانع کے ذریعہ وجود میں آتی ہے، اگر کوئی شخص کسی مکان کے بارے میں دعویٰ کرے کہ یہ از خود بن کر کھڑا ہو گیا ہے تو لوگ اسے پاگل سمجھیں گے، تو یہ وسیع وعریض کائنات کسی خالق کے بغیر کیسے وجود میں آسکتی ہے؟ قرآن مجید میں بار بار اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، جیسے ارشاد ہے :

اَفِی اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۔ (ابراہیم:۱۰)

(ب) کائنات میں ہر لمحہ تغیر کا عمل جاری ہے، ہر دن کے بعد رات آتی ہے، اور رات

کے بعد دن آتا ہے، انسان بیمار پڑتا ہے، پھر صحت حاصل ہوتی ہے، بچہ بڑھ کر جوان اور پھر بوڑھا ہوتا ہے، مختلف مخلوقات پیدا ہوتی ہیں، پھر موت اور فنا سے دو چار بھی ہوتی ہیں، تبدیلی اور ترقی کسی محرک اور عامل کی محتاج ہوتی ہے، ایسا نہیں ہے کہ لکڑی کے تختے رکھ دیئے جائیں، وہ خود بخود ٹکڑے بن جائیں اور یہ ٹکڑے جڑ کر کرسی اور پلنگ کی صورت اختیار کرلیں، ہر تبدیلی کے پیچھے کاریگر کا عمل ہوتا ہے، یہ بھی اس بات کی دلیل ہے کہ کائنات جو مسلسل تغیر، حرکت وسکون اور ترقی کی منزل سے گزر رہی ہے، اس کے پیچھے ایک طاقت کارفرما ہے اور اسی طاقت کا نام اللہ ہے؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا :

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ۔ (آل عمران:۱۹۰)

اس میں اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر 'اختلاف اللیل والنہار' کا ذکر فرمایا ہے۔

(ج) کائنات میں جو چیزیں پائی جاتی ہیں، وہ اپنے مقررہ کام میں مشغول ہیں، ان کے درمیان ایک خاص قسم کا توازن وارتباط ہے، جیسے : فضا میں ہزاروں سیارے گردش کررہے ہیں، انسان جن گاڑیوں کو چلاتا ہے، آئے دن ان میں ایکسیڈنٹ ہوتا رہتا ہے؛ لیکن کبھی سورج اور چاند میں کوئی تصادم نہیں ہوا اور نہ فضا میں تیرتے ہوئے ہزاروں ستاروں کے درمیان ایکسیڈنٹ کی نوبت آئی، جب تک کوئی ایسی ذات موجود نہ ہو جو حکمت کے ساتھ کائنات کی تمام مخلوقات کو کنٹرول میں رکھتے ہوئے ان سے کام لے، اس وقت تک یہ نظام برقرار نہیں رہ سکتا، خدا کے بغیر کائنات کے اس نظام کے چلتے رہنے کا دعویٰ کرنا ایسا ہی ہے، جیسا کوئی شخص کہے کہ جہاز اور ٹرین بغیر کسی کپتان اور ڈرائیور کے یا الیکٹرونک کنٹرول کے خود بخود چل رہے ہیں، اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اس کی طرف اشارہ فرمایا ہے، جیسے فرمایا گیا :

- اَلشَّمْسُ وَ الْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ ۔ (سورہ رحمٰن:۵)
- وَ السَّمَآءَ رَفَعَهَا وَ وَضَعَ الْمِیْزَانَ ۔ (سورہ رحمٰن:۷)
- اِنَّا كُلَّ شَیْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ ۔ (قمر:۴۹)

● سُبۡحٰنَ الَّذِیۡ خَلَقَ الۡاَزۡوَاجَ کُلَّهَا مِمَّا تُنۡۢبِتُ الۡاَرۡضُ وَمِنۡ اَنۡفُسِهِمۡ وَمِمَّا لَا يَعۡلَمُوۡنَ ، وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الَّيۡلُ نَسۡلَخُ مِنۡهُ النَّهَارَ فَاِذَا هُمۡ مُّظۡلِمُوۡنَ ، وَالشَّمۡسُ تَجۡرِىۡ لِمُسۡتَقَرٍّ لَّهَا ذٰلِكَ تَقۡدِيۡرُ الۡعَزِيۡزِ الۡعَلِيۡمِ ، وَالۡقَمَرَ قَدَّرۡنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالۡعُرۡجُوۡنِ الۡقَدِيۡمِ ، لَا الشَّمۡسُ يَنۡۢبَغِىۡ لَهَاۤ اَنۡ تُدۡرِكَ الۡقَمَرَ وَلَا الَّيۡلُ سَابِقُ النَّهَارِ وَكُلٌّ فِىۡ فَلَكٍ يَّسۡبَحُوۡنَ ۔ (یٰسین:۳۶-۴۰)

(د) انسان کا وجود بجائے خود اللہ تعالیٰ کے وجود کی دلیل ہے، ایک ہی ماں باپ سے کئی بچے پیدا ہوتے ہیں، ان کی شکل وصورت میں فرق ہوتا ہے، آواز میں فرق ہوتا ہے، مزاج اور رویہ میں فرق ہوتا ہے، ایک ہی مادہ اشتقاق سے تعلق رکھنے کے باوجود ان کے درمیان فرق کا پایا جانا کسی قادر مطلق اور حکیم ودانا منتظم ومدبر کے بغیر نہیں ہوسکتا، اگر لکڑی سرخی مائل ہوتو اس سے جو چیز بنے گی، وہ اسی رنگ کی ہوگی، سونے سے جو چیز بھی بنائی جائے گی، وہ زرد ہوگی؛ لیکن انسان کی ذات میں غیر معمولی تنوع پایا جاتا ہے، یہ کسی حکیم حاکم کے بغیر نہیں ہوسکتا؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

وَمِنۡ اٰيٰتِهٖ خَلۡقُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافُ اَلۡسِنَتِكُمۡ وَاَلۡوَانِكُمۡ اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلۡعٰلِمِيۡنَ ۔ (سورہ روم:۲۲)

(ہ) انسانی فطرت تقاضا کرتی ہے کہ وہ اس کائنات کے پیچھے خالق ومالک کے وجود کو تسلیم کرے؛ اسی لئے انسانی تاریخ میں ہمیشہ انسان کی غالب ترین اکثریت نے کسی نہ کسی صورت میں خدا کے وجود کو تسلیم کیا ہے، اگرچہ بہت سی قوموں نے اس کی ذات وصفات کی معرفت میں ٹھوکر کھائی ہے؛ چنانچہ تاریخ میں ہمیشہ خدا کا انکار کرنے والے بہت کم رہے ہیں، تمام مذہبی صحائف کے مطالعہ سے یہی بات معلوم ہوتی ہے اور آج بھی دنیا میں خدا کا انکار کرنے والوں کی تعداد بہت کم ہے۔

جو لوگ خدا کے وجود کو نہیں مانتے، ان کے پاس اپنے دعوی پر کوئی دلیل نہیں ہے، یہ

سمجھنا کہ چوں کہ خدا نظر نہیں آتا؛ اس لئے اس کا وجود نہیں ہے، ایسی بات ہے جس کو عقل سلیم قبول نہیں کرسکتی، دنیا میں کتنی ایسی چیزیں ہیں، جو نظر نہیں آتی ہیں، یا جن کو حواس خمسہ ظاہرہ سے محسوس نہیں کیا جاسکتا ہے؛ لیکن ہر شخص اس کے وجود کو تسلیم کرتا ہے، انسان کے اندر روح اور زندگی کا ہونا اور موت کے وقت اس کا نکل جانا سب کو تسلیم ہے؛ لیکن انسانی آنکھیں اس کا مشاہدہ نہیں کرسکتیں، فضا ہر وقت 'ہوا' سے معمور رہتی ہے؛ لیکن ہم اسے دیکھ نہیں سکتے اور جب تک اس کی حرکت بڑھ نہ جائے، اس وقت تک ہم اپنے حواس سے بھی محسوس نہیں کرسکتے، اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل وفہم کی دولت عطا فرمائی ہے، ہم انسان کے رویہ کو دیکھ کر اس کے اندر عقل کو تسلیم کرتے ہیں؛ لیکن ہم ہاتھ پاؤں کی طرح نہ اس کا ادراک کرسکتے ہیں اور نہ کسی پیمانے سے اس کی مقدار کو جانچ سکتے ہیں؛ اس لئے کسی چیز کا نظر نہ آنا یا حواس ظاہرہ کے ذریعہ اس کا ادراک نہ ہونا اس کے موجود نہ ہونے کی دلیل نہیں ہوسکتی۔

ملحدین اور خدا کے منکرین کائنات میں جاری حرکت وسکون کی توجیہ کرتے ہیں کہ یہ چیز اس کی فطرت میں رکھ دی گئی ہے اور فطرت کی بنا پر مسلسل ایسا ہو رہا ہے؛ لیکن یہ بھی ایک ایسا دعویٰ ہے جس پر کوئی دلیل نہیں ہے، اگر کسی چیز کو فعال رکھنے کے لئے فطرت کافی ہوتی تو ان کے درمیان یکسانیت ہونی چاہئے تھی، ہر پودا جو ایک طرح کی زمین میں لگایا جائے، اس کی نشوونما ایک ہی طرح پر ہوتی، ہر سیب کے سائز اور مٹھاس میں یکسانیت ہوتی، ہر شوہر و بیوی جن میں ماں باپ بننے کی صلاحیت ہے، ضرور ہی ماں باپ بنتے، انسان کے وجود میں جو اجزاء شامل ہیں، جیسے: لوہا، پتھر، چونا، پانی وغیرہ، اگر انسان ان سب کو ملا کر ایک پتلا بنا دیتا تو اس میں انسان ہی کی طرح بولنے، سننے، اور لکھنے پڑھنے کی صلاحیت پیدا ہوجاتی؛ لیکن ایسا نہیں ہے، اس سے معلوم ہوا کہ مادّہ ازخود کسی چیز کی تخلیق یا تشکیل نہیں کرتا؛ بلکہ کوئی ذات ہے جس کے حکم سے چیزیں وجود میں آتی ہیں اور وہ مختلف شکلیں اختیار کرتی ہیں، وہی حاکم خدا کی ذات ہے۔

توحید

اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے میں یہ بات شامل ہے کہ اس کو ایک اور یکتا مانا جائے، اسی کو 'توحید' کہتے ہیں، اللہ تعالیٰ کا ایک ہونا نہ صرف قرآن مجید کا حکم ہے؛ بلکہ عقل کا تقاضا بھی ہے، خدا علیم و حکیم ہے اور کائنات کی تمام چیزوں کی تدبیر فرماتا ہے، اور جب کسی بات کا فیصلہ کرنا ایک سے زیادہ افراد کے اختیار میں ہو تو اختلاف رائے پیدا ہونا، پھر اس اختلاف کی وجہ سے نزاع کا پیدا ہونا، اور اس نزاع کا باعث فساد بننا بالکل ظاہر ہے، تو اگر کائنات کے کئی خدا ہوتے تو تسلسل اور نظم وضبط کے ساتھ اس کا نظام قائم نہیں رہ پاتا، یہ کائنات فساد اور ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتی؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۔ (الانبیاء:۲۲)

جب ایک چھوٹے سے ملک کا دو صدر نہیں ہو سکتا، ایک ریاست کے دو وزیر اعلیٰ نہیں ہو سکتے، یہاں تک کہ انسانی خاندانی نظام کو دیکھیں کہ ایک انسان کے دو باپ نہیں ہو سکتے تو اتنی بڑی پُر پیچ کائنات —— جس کے انتظام و انصرام میں قدم قدم پر اختلاف رائے ہو سکتا ہے —— کو ایک سے زیادہ خدا مل کر کیسے چلا سکتا ہے؟

توحید کی دو قسمیں ہیں: توحید فی الالوہیت، توحید فی الربوبیت۔

توحید فی الالوہیت

توحید فی الالوہیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ ہی تنہا معبود ہے، اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، نہ فرشتہ، نہ جن، نہ کوئی بڑا سے بڑا انسان، نہ سورج، چاند، ستارے، نہ سمندر اور پہاڑ اور نہ کوئی درخت اور جانور؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

- وَ مَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَآءَ ۔ (البینۃ:۵)
- قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَ نُسُكِيْ وَ مَحْيَايَ وَ مَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ، لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَ بِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ ۔ (انعام:۱۶۲-۱۶۳)

لہٰذا :

☆ عقیدہ تثلیث جس میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ ساتھ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور روح القدس کو بھی خدا مانا جاتا ہے، درست نہیں ہے؛ اگرچہ عیسائی اپنے آپ کو موحد کہتے ہیں؛ لیکن یہ صحیح نہیں ہے، یہ شرک ہے۔

☆ مجوسی دو خدا مانتے ہیں: یزداں اور اَہرمن، ایک کو خالقِ خیر اور ایک کو خالقِ شر قرار دیتے ہیں، یہ توحید کے خلاف ہے۔

☆ ہندوستان میں آریہ سماجی ایک خدا کو ماننے کا دعویٰ کرتے ہیں؛ لیکن مورتیوں اور مختلف شخصیتوں کی پوجا بھی کرتے ہیں، یہ بھی توحید کے خلاف ہے۔

☆ سناتن دھرم کے ماننے والے تین خداؤں کے قائل ہیں، برہما، وِشنو، شِیو، یہ بھی توحید کے خلاف ہے۔

☆ بہت سی مشرک قومیں قدرت کے مختلف مظاہر اور مخلوقات کی پوجا کرتی ہیں، جیسے: آگ کی، سانپ کی، گائے کی، بعض دریاؤں کی، پہاڑوں اور درختوں کی، یہ بھی کھلے طور پر شرک کے مرتکب ہیں۔

☆ آج کل مغربی دنیا میں بعض ایسے گروہ پیدا ہوئے ہیں جو شیطان کی عبادت کرتے ہیں، یہ بھی مشرک ہیں۔

عبادت کی مختلف شکلیں

عبادت میں وہ تمام چیزیں شامل ہیں جو اپنی بندگی اور کسی کی معبودیت کے احساس کے ساتھ کیا جاتا ہو، ان میں سے چند یہ ہیں :

(۱) نماز: نماز صرف اللہ ہی کے لئے پڑھی جائے گی، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۔ (۱)

---

(۱) الانعام: ۱۶۲۔

(۲) غیبی مدد طلب کرنا: جس کو قرآن مجید میں استعانت سے تعبیر کیا گیا ہے؛ چنانچہ ارشاد ہے :

اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنَ ۔ (۱)

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا :

إذا سألت فسأل الله وإذا استعنت فاستعن بالله ۔ (۲)

(۳) دُعاء: غیبی مدد طلب کرنے ہی کی ایک صورت دعا ہے، اسباب اور تدبیر کے درجہ میں جو مدد کی جاتی ہے، وہ تو ایک انسان دوسرے انسان سے مانگ سکتا ہے، جیسے: کسی سے استعمال کے لئے سواری مانگ لینا، کسی سے کھانا طلب کر لینا؛ لیکن نصرت غیبی کا طلب کرنا اللہ تعالیٰ کے لئے مخصوص ہے اور اسی کا نام دُعا ہے؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

- فَادۡعُوا اللّٰہَ مُخۡلِصِیۡنَ لَہُ الدِّیۡنَ وَلَوۡ کَرِہَ الۡکٰفِرُوۡنَ ۔ (۳)
- وَّاَنَّ الۡمَسٰجِدَ لِلّٰہِ فَلَا تَدۡعُوۡا مَعَ اللّٰہِ اَحَدًا۔ (۴)
- وَ لَا تَدۡعُ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ مَا لَا یَنۡفَعُکَ وَ لَا یَضُرُّکَ فَاِنۡ فَعَلۡتَ فَاِنَّکَ اِذًا مِّنَ الظّٰلِمِیۡنَ ۔ (۵)

(۴) قربانی: قربانی بھی ایک عبادت ہے؛ اس لئے قربانی اللہ ہی کے لئے کی جائے گی: ’’فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانۡحَرۡ ‘‘۔(۶)

(۵) جانور کو ذبح کرنا چوں کہ قربانی کا حصہ ہے، اس لئے اللہ ہی کے نام سے جانور ذبح کیا جائے گا، اگر غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا جائے تو جانور حرام ہوجائے گا اور یہ فعل شرک ہوگا :

لَا تَاۡکُلُوۡا مِمَّا لَمۡ یُذۡکَرِ اسۡمُ اللّٰہِ عَلَیۡہِ ۔(۷)

---

(۱) سورۃ الفاتحہ:۵۔ (۲) ترمذی، حدیث نمبر:۲۵۱۶۔
(۳) غافر؍مومن:۱۴۔ (۴) جن:۱۸۔
(۵) یونس:۱۰۶۔ (۶) کوثر:۲۔
(۷) الانعام:۱۲۱۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا :

لعن اللہ من ذبح لغیر اللہ ۔ (۱)

(۶) اسی طرح غیر اللہ کے نام پر جانور چھوڑنا بھی توحید کے منافی ہے اور شرک میں داخل ہے؛ اسی لئے قرآن مجید میں اس کو حرام قرار دیا گیا ہے :

مَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۔ (المائدہ:۳)

(۷) اسی طرح غیر اللہ کی تقدیس کے لئے کسی جگہ جانور ذبح کیا جاتا ہو، تو تقدیس واحترام کی نیت سے وہاں جانور ذبح کرنا بھی شرک میں داخل ہے : ''وَ مَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ''۔ (المائدہ:۳)

(۸) سجدہ: سجدہ نماز کا ایک اہم رکن ہے، اور اللہ تعالیٰ کے سامنے کامل درجہ کا تذلل اور خضوع ہے؛ اسی لئے صرف اللہ کو سجدہ کیا جاسکتا ہے، غیر اللہ کو نہیں کیا جاسکتا؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَ لَا لِلْقَمَرِ وَ اسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَهُنَّ اِنْ كُنْتُمْ اِیَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ۔ (فصلت:۳۷)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بعض صحابہ نے سجدہ کی اجازت چاہی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منع کر دیا اور فرمایا :

لو کنت آمراً أن یسجد لأحد لأمرت النساء أن یسجدن لأزواجھن ۔ (۲)

(۹) استعاذہ: استعاذہ کے معنی ہیں غیبی طاقت سے مصیبت کے مقابلہ میں پناہ مانگنا؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

- فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ۔ (غافر:۵۶)
- قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ۔ (الفلق:۱)
- قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۔ (الناس:۱)

---

(۱) مسلم عن ابی الطفیل، حدیث نمبر: ۱۹۷۸۔ (۲) ابوداؤد عن قیس بن سعد، حدیث نمبر: ۲۱۴۰۔

اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور سے پناہ طلب کرنا جائز نہیں۔

(۱۰) توکل: یعنی ظاہری اسباب سے ماوراء ہو کر کسی کو اپنا کارساز ماننا اور اس پر بھروسہ کرنا؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

وَ عَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۔ (المائدہ:۲۳)

(۱۱) طواف: کسی مقام کا یہ سمجھ کر پھیرا لگانا کہ اس پر اجر و ثواب حاصل ہوگا، صرف بیت اللہ شریف ہی کا جائز ہے؛ کیوں کہ اس کی نسبت اللہ تعالیٰ سے ہے، اور اس کا مقصود اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنا ہے، کسی اور جگہ کا طواف جائز نہیں۔

غرض کہ ''توحید الوہیت'' کا مطلب یہ ہے کہ جو بھی عمل عبادت کے دائرہ میں آتا ہو، اس کو اللہ تعالیٰ کے لئے مخصوص رکھا جائے۔

توحید ربوبیت

رب کے معنی ہیں کسی چیز کی لمحہ بہ لمحہ پرورش کرنے والا، اور توحید ربوبیت سے یہ مراد ہے کہ ایسا نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات کو پیدا کر دیا اور وہ اس سے بے تعلق ہو گیا، اکثر مشرک قومیں شرک میں اس لئے مبتلا ہوتی ہیں کہ وہ اللہ کو مانتی ہیں؛ لیکن سمجھتی ہیں کہ کائنات میں سارا تصرف براہ راست اللہ تعالیٰ نہیں کرتے؛ بلکہ اللہ تعالیٰ نے مختلف دیویوں اور دیوتاؤں کو الگ الگ کام سپرد کر دیئے ہیں، کسی کو رزق، کسی کو علم، کسی کو طاقت اور کسی کو اولاد وغیرہ، اللہ تعالیٰ ہی کے رب ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ ہی نے اس کائنات کو پیدا بھی فرمایا ہے اور وہی اس کائنات کے نظم کو چلا بھی رہا ہے؛ اس لئے ایسا نہیں ہوسکتا کہ عبادت تو اللہ کی کی جائے اور مرادیں دوسروں سے مانگی جائیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

لَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۔ (اعراف:۵۴)

اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَّ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ۔ (زمر:۶۲)

لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يَقْدِرُ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۔ (شوریٰ:۱۲)

صفاتِ باری

اللہ تعالیٰ کی ذات صفات سے خالی نہیں ہے؛ کیوں کہ صفات سے ذات کے کمالات ظاہر ہوتے ہیں، اور خالق کائنات سے بڑھ کر خوبیوں کا مالک کون ہوسکتا ہے؟ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی بہت سی صفات کا ذکر آیا ہے، اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھنے میں یہ بات شامل ہے کہ اللہ کے لئے جو اسماء وصفات قرآن وحدیث سے ثابت ہیں، ان کو مانا جائے، نہ ان کا انکار کیا جائے اور نہ اللہ تعالیٰ کی صفات کو مخلوق کے مشابہ سمجھا جائے؛ بلکہ اللہ کی ذات کو ہر طرح کے نقص اور عیب سے منزہ سمجھا جائے۔

اللہ تعالیٰ کی صفات بنیادی طور پر دو قسم کی ہیں: صفات ذاتیہ، جن کو صفات لازمہ بھی کہا جاتا ہے، اور صفات فعلیہ، جن کو صفات اختیاریہ بھی کہا جاتا ہے۔

صفاتِ ذاتیہ وہ صفات ہیں، جن سے اللہ تعالیٰ ہر وقت متصف ہوتے ہیں، اور اس کی برعکس صفت سے پاک ہیں، اشاعرہ کے نزدیک وہ صفات یہ ہیں: حیات، علم، قدرت، سمع، بصر، حکمت، علو، ماتریدیہ کے نزدیک صفت تکوین بھی صفاتِ ذاتیہ میں ہے۔

صفاتِ فعلیہ وہ ہیں جن کا ظاہر ہونا اللہ تعالیٰ کی مشیت سے متعلق ہو، اللہ تعالیٰ جب چاہتے ہیں اسے کرتے ہیں اور جب چاہتے ہیں نہیں کرتے ہیں، نیز اللہ تعالیٰ اس کی برعکس صفت سے بھی متصف ہوتے ہیں، صفات فعلیہ میں سے بعض یہ ہیں: نزول، غضب، فرحت، ضحک، مجیء، وغیرہ۔

بعض صفات میں دونوں جہتیں پائی جاتی ہیں، جیسے کلام کہ اپنی اصل کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کی ذاتی صفت ہے؛ لیکن کسی خاص مخلوق کے ساتھ تکلم کے اعتبار سے صفاتِ فعلیہ میں سے ہے۔

متشابہات (تفویض وتاویل)

اللہ تعالیٰ کی بعض صفات متشابہات میں سے ہیں، یعنی ان کا لغوی معنی تو معلوم ہے؛

لیکن کیفیت معلوم نہیں ہے، جیسے: اللہ کے لئے ہاتھ، پاؤں، استواء علی العرش وغیرہ، ان صفات میں جو تعبیر وارد ہوئی ہے، اس سے بظاہر مخلوق سے مشابہت معلوم ہوتی ہے؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کے لئے ہاتھ پاؤں کی تخلیق فرمائی ہے اور اس کو جسم دیا ہے، جس کے ذریعہ نزول اور استواء وغیرہ کی کیفیت وجود میں آتی ہے، جب کہ اللہ تعالیٰ جسم اور اعضاء سے ماوراء ہیں اور خالق اور مخلوق میں کوئی مماثلت اور مشابہت نہیں ہوسکتی؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ وَ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ۔ (شوریٰ:۱۱)

ان صفات کے بارے میں اہل سنت والجماعت کے نزدیک دو طریق ہیں: تفویض اور تاویل۔

تفویض سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لئے ان صفات کو مانا جائے اور ان کی کیفیت متعین نہ کی جائے، اس کو اللہ کے حوالہ کردیا جائے، محدثین نے زیادہ تر اسی طریقہ کو اختیار کیا ہے؛ چنانچہ جب امام مالکؒ سے ''علی العرش استوی'' کا معنی دریافت کیا گیا تو انھوں نے فرمایا:

الاستواء معلوم والکیف مجهول والإیمان به واجب والسؤال عنه بدعة ۔ (۱)

محدثین اور حنابلہ نے عام طور پر تفویض کو ترجیح دی ہے۔

تاویل سے مراد یہ ہے کہ جن صفات سے بظاہر تشبیہ (مخلوق کی مشابہت)، تجسیم (ذی جسم ہونا)، یا جہت یا صورت کا مفہوم ظاہر ہوتا ہو، جو اللہ تعالیٰ کے شایان شان نہیں ہے، تو اس سے مجازی معنی مراد لیا جائے، جیسے: ''ید'' سے مراد طاقت، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''ید اللہ علی الجماعۃ'' (۲) ''کان'' سے مراد سمع، عین سے مراد رؤیت اور نزول سے مراد توجہ وغیرہ، اشاعرہ اور ماتریدیہ نے عام طور پر تاویل کو ترجیح دی ہے۔

تفویض کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ذی جسم مانا جائے، جیسا کہ مجسمہ اور مشبہہ کہا کرتے تھے، اور نہ تاویل کا مقصد صفات باری کا انکار ہے، دونوں کا مقصد ایک ہی ہے کہ

(۱) الفواکہ الدوانی، باب ما تنطق بہ الالسنہ: ۱/۵۱۔ (۲) سنن نسائی، کتاب تحریم الدم، حدیث نمبر: ۴۰۲۰۔

اللہ تعالیٰ کے لئے اس کے شایان شان صفات جمیلہ کو مانا جائے اور اللہ تعالیٰ کی طرف کسی ایسی چیز کی نسبت نہیں کی جائے جو اس کی شان کے خلاف ہو۔

تاویل کی بھی اہمیت ہے؛ کیوں کہ اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ قرآن مجید میں بہت سے الفاظ مجازی معنی میں استعمال ہوئے ہیں، اور صحابہ سے بھی ایسی تفسیر منقول ہے جو تاویل پر مبنی ہے، جیسے: ''والسماء بنيناها بأيد'' کی تفسیر میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے ''بأيد'' کی تفسیر بالقوۃ سے کی ہے،(۱) یا ''وسع كرسيه السموات والأرض'' میں کرسی کی تفسیر علم سے کی ہے، (۲) نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو فہم قرآن کی دُعاء دی، تو اس میں تاویل ہی کا لفظ استعمال فرمایا: ''اللّٰهم فقهه فی الدين وعلمه التأويل''۔(۳)

غرض کہ تفویض اور تاویل دونوں درست ہیں اور دونوں کا مقصد ایک ہی ہے؛ اس لئے ان میں سے کسی کو گمراہ نہیں کہا جاسکتا؛ چنانچہ امام نوویؒ تفویض کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

إعلم أن لأهل العلم فی أحاديث الصفات وآيات الصفات قولين : أحدهما : وهو مذهب معظم السلف أو كلهم أنه لا يتكلم فی معناها۔ (۴)

اور دوسرے طریق 'تاویل' کے بارے میں فرماتے ہیں :

والثانی مذهب أكثر المتكلمين وجماعات من السلف وهو محكی هنا عن مالك والأوزاعی أنها تتأول علی ما يليق بها بحسب مواطنها۔ (۵)

انسانی زندگی پر عقیدۂ توحید کا اثر

عقیدۂ توحید جہاں ایک حقیقت کا اعتراف ہے اور اس سے آخرت کی نجات متعلق ہے،

---

(۱) تفسیر طبری: ۷/۲۷۔ (۲) تفسیر طبری: ۳/۹۔
(۳) صحیح ابن حبان، حدیث نمبر: ۷۰۵۵۔ (۴) شرح مسلم للنووی، کتاب الایمان: ۳/۱۹۔
(۵) شرح مسلم للنووی، کتاب صلاۃ المسافرین: ۶/۳۶۔

وہیں اس دنیا میں بھی اس کے گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں، اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ تمام انسانوں کے درمیان برابری اور اخوت کا جذبہ پروان چڑھتا ہے، انسانوں کا ایک گروہ دوسرے گروہ کو حقارت کی نظر سے نہیں دیکھتا اور تکبر میں مبتلا نہیں ہوتا؛ کیوں کہ جب وہ سمجھتا ہے کہ ایک ہی خدا نے تمام مخلوق کو پیدا کیا ہے تو جیسے ایک باپ سے پیدا ہونے والی تمام اولاد پیدائشی طور پر سب بھائی بہنوں کو برابر سمجھتی ہے، اسی طرح انسان کے اندر یہ یقین پیدا ہوتا ہے کہ تمام بنی نوع انسان برابر ہیں، کوئی انسان پیدائشی طور پر بڑا یا چھوٹا نہیں ہوتا؛ اسی لئے اسلام میں تمام انسانوں کو بحیثیت انسان برابر مانا گیا ہے۔

عقیدۂ توحید کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اس سے جذبۂ تحقیق کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے، جب انسان مخلوق کو خدا نہیں سمجھتا، وہ یقین کرتا ہے کہ سورج اور چاند سے لے کر چیونٹی اور مچھر تک سب اللہ کی مخلوق ہیں تو اس کو کسی بھی مخلوق پر ریسرچ کرنے میں کوئی جھجھک محسوس نہیں ہوتی، اگر انسان بعض مخلوقات کو خدا تصور کرنے لگے تو یہ تصور تحقیق میں رکاوٹ بن جاتا ہے؛ کیوں کہ جو چیز قابل تعظیم اور لائق احترام ہو، وہ تحقیق و تفتیش سے ماوراء ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دنیا میں تشریف لانے کے بعد انسانیت نے جس تیزی سے علم و تحقیق کا سفر طے کیا، اس سے پہلے ایسا نہیں ہوسکا، یہاں تک کہ کلیسا کے دور اقتدار میں سائنسی تحقیق کو بدترین جرم قرار دے دیا گیا تھا، اسلام کے تصورِ توحید نے سائنسدانوں کی حوصلہ افزائی کی اور مسلمان سائنسدانوں نے کئی صدیوں تک علم و تحقیق کے کاموں کو آگے بڑھایا اور اسی کا نتیجہ ہے کہ وہ عظیم صنعتی انقلاب آیا جس کا تیز رفتار سفر اب بھی جاری ہے۔

تمرینی سوالات

(۱) اللہ تعالیٰ کے موجود ہونے کی کیا دلیل ہے؟

(۲) توحید الوہیت سے کیا مراد ہے؟

(۳) عبادت کی مختلف شکلیں جو اللہ کے لئے مخصوص ہیں، ان پر روشنی ڈالئے؟

(۴) توحید ربوبیت سے کیا مراد ہے؟

(۵) اللہ تعالیٰ کی صفاتِ ذاتیہ سے کیا مراد ہے اور یہ کون کونسی ہیں؟

(۶) صفاتِ فعلیہ سے کیا مراد ہے؟

(۷) اللہ تعالیٰ کی جو صفاتِ متشابہات کے دائرہ میں آتی ہیں، ان کے سلسلے میں اہلِ سنت نے دو طریقے اختیار کئے ہیں، وہ کیا ہیں؟ مثالوں سے واضح کریں۔



انبیاء پر ایمان

اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں پر ایمان لانے کا حکم دیا ہے، ان میں ایک انبیاء ورسل ہیں؛ چنانچہ ارشاد ہے :

وَ لٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَ النَّبِيّٖنَ ۔ (بقرہ:۱۷۷)

جیسے اللہ تعالیٰ کا انکار کفر ہے، اسی طرح نبی کی نبوت کا انکار بھی کفر ہے؛ چنانچہ ارشاد ہے :

وَ مَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا ۔ (النساء:۱۳۶)

نبوت کی ضرورت

نبی کا بھیجا جانا انسان کے لئے اللہ کی بہت بڑی رحمت ہے، آخرت کی زندگی سے متعلق حقائق پردۂ غیب میں ہیں، اس کے بارے میں ہمیں سب کچھ انبیاء اوران کے ذریعہ آنے والی کتابوں ہی سے معلوم ہوتا ہے، دنیا میں کس طرح خوشگوار اور مامون زندگی گزاری جائے، اس کے لئے بھی ہمیں انبیاء کی تعلیمات کی ضرورت ہے؛ کیوں کہ انسان کے اندر تین ایسی چیزیں پائی جاتی ہیں، جن کی وجہ سے اس کی قوت فیصلہ متاثر ہوجاتی ہے اور وہ اپنے اعضاء وجوارح کا اور اپنے گرد پھیلی ہوئی کائنات کا کس طرح استعمال کرے؟ اس کا درست فیصلہ نہیں کر پاتا، ایک: جہالت ولاعلمی، دوسرے: غلبہ شہوت، تیسرے: ظلم وناانصافی۔

چنانچہ انسان بہت سی ایسی چیزیں کھاتا رہا ہے یا کھا رہا ہے، جس کے نقصان دہ ہونے سے وہ واقف نہیں ہے، وحی کے ذریعہ ان کا حرام ہونا معلوم ہوا، اب موجودہ سائنس نے بھی اس حقیقت سے پردہ اُٹھایا ہے کہ یہ چیزیں انسان کے لئے نقصان دہ ہیں۔

اسی طرح بعض چیزوں کو وہ نقصان دہ سمجھتا ہے؛ لیکن پھر بھی غلبۂ شہوت کی وجہ سے وہ اسے کرنا چاہتا ہے، جیسے شراب اور زنا؛ کہ صحت انسانی کے لئے ان کا نقصان دہ ہونا اطباء کے نزدیک متفق علیہ ہے؛ لیکن پھر بھی جب قانون کی لگام انسان کے ہاتھ میں ہوتی ہے تو وہ غلبہ شہوت کی وجہ سے اس کی اجازت دے دیتا ہے۔

تیسرے : انسانی معاشرہ میں عدل کے بغیر امن وسکون قائم نہیں ہوسکتا ، اور عدل وانصاف اسی وقت قائم ہوگا ، جب تمام انسانوں کو برابر سمجھتے ہوئے زندگی کے اُصول بنائے جائیں ، اگر انسان کو زندگی کے نظام بنانے کا حق دیا جائے تو چوں کہ وہ خود کسی نہ کسی گروہ سے متعلق ہوگا؛ اس لئے اس بات کی بہت کم توقع ہے کہ وہ اپنے گروہ کے ساتھ ترجیحی سلوک نہ کرے، انسانی تاریخ اس تجربہ سے پُر ہے، جس میں مردوں نے عورتوں کے ساتھ، گوروں نے کالوں کے ساتھ، اور ایک نسل کے لوگوں نے دوسری نسل کے لوگوں کے ساتھ امتیازی سلوک کیا اور ظلم وجور کو روا رکھا۔

نبی کے ذریعہ انسان کے پاس اللہ تعالیٰ کا مقرر کیا ہوا قانونِ زندگی آتا ہے، اللہ تعالیٰ انسان کی ذات سے بھی واقف ہیں کہ انسان کو اپنے جسم سے کس طرح کام لینا چاہئے جو اس کے لئے مفید ہوگا ، اور کس بات سے بچنا چاہئے جو اس کے لئے نقصان دہ ہوگا ؟ اللہ تعالیٰ کے فیصلہ میں غلبۂ شہوت کا کوئی امکان نہیں ، وہ انسان کا خالق ہے اور خوب واقف ہے کہ اس کی کون سی خواہشات لائق تکمیل ہیں اور کون سی خواہشات قابل ترک ہیں ؟ اور چوں کہ تمام انسان اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں ، کسی گروہِ انسانی کو پیدائشی طور پر اللہ تعالیٰ سے خصوصی قربت حاصل نہیں ہے ؛ اس لئے وہ جو حکم دے گا ، وہ عدل وانصاف پر مبنی ہوگا ؛ اس لئے نبی کے ذریعہ آئی ہوئی تعلیمات میں آخرت کی بھی کامیابی ہے اور دنیا کی بھی ۔

ہم دنیا میں بھی دیکھتے ہیں کہ جب کوئی مشین بنتی ہے تو مشین بنانے والا اپنے گاہکوں کی دو طریقہ پر رہنمائی کرتا ہے، ایک تو مشین کی ٹکنالوجی سے واقف اپنے نمائندہ کو بھیجتا ہے، جو اس کو اس کے استعمال کا طریقہ بتائے ، دوسرے : تعارفی کتابچہ بھی دیتا ہے؛ تاکہ لوگ اس

مشین کے طریقۂ استعمال اور کارکردگی کو اچھی طرح سمجھ لیں، اگر غور کیا جائے تو یہ کائنات لاکھوں مشینوں کا مجموعہ ہے؛ بلکہ خود انسان کا جسم کتنی ہی پیچیدہ اور نازک مشینوں سے بنا ہوا ہے، آنکھ ایک مشین ہے، کان ایک مشین ہے، دل ودماغ اور گردہ وجگر الگ الگ مشینیں ہیں، اس لئے انسان کو اس بات کی شدید ضرورت تھی کہ اس کے خالق ومالک کی طرف سے اس کی رہنمائی ہو؛ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے انبیاء بھیجے اور انبیاء پر کتابیں نازل فرمائیں۔

نبی اور رسول

اللہ تعالیٰ نے جن برگزیدہ شخصیات کو اپنا پیغام لے کر بھیجا ہے، ان کے لئے دو الفاظ استعمال کئے گئے ہیں: نبی اور رسول۔

''نبأ'' کے معنی سچی خبر کے ہیں، اسی سے فعیل کے وزن پر نبی کا لفظ ہے، جس کے معنی ہیں سچی خبر دینے والا۔(۱)

اصطلاح میں نبی کی تعریف شیخ عبدالقادر بغدادیؒ نے اس طرح کی ہے :

کل من نزل علیه الوحی من الله عزوجل علی لسان أحد الملائكة ، وكان مؤیداً بنوع من الكرامات الناقضة للعادات ۔ (۲)

رسالت کے معنی پیغام کے ہیں، اسی سے رسول کا لفظ مشتق ہے، یعنی پیغام پہنچانے والا، رسول کی تعریف بعض اہل علم نے اس طرح کی ہے :

الرسول فی الشرع : إنسان بعثه الله تعالیٰ إلی الخلق لتبلیغ الأحكام ۔ (۳)

بنیادی باتوں میں نبی اور رسول دونوں شامل ہوتے ہیں، دونوں پر اللہ کی طرف سے

---

(۱) لسان العرب:۱/۱۶۲۔

(۲) الموسوعۃ الفقہیہ: ۴۰/۴۰۔

(۳) التعریفات للجرجانی:۱۱۰۔

وحی نازل ہوتی ہے، دونوں اللہ کے بندوں کی اصلاح کے لئے بھیجے جاتے ہیں، دونوں معصوم ہوتے ہیں؛ اسی لئے بعض دفعہ ایک ہی شخصیت کو قرآن میں نبی اور رسول دونوں سے تعبیر فرمایا گیا ہے، جیسے ارشاد ہے :

وَ اذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مُوْسٰٓى اِنَّهٗ كَانَ مُخْلَصًا وَّ كَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ۔ (مریم:۵۱)

نبی اور رسول میں کیا فرق ہے؟ قرآن وحدیث میں اس سلسلہ میں کوئی واضح بات ذکر نہیں کی گئی ہے؛ علماء نے قرآن کے اشارات کو سامنے رکھ کر تین فرق بیان کئے ہیں اور تینوں کے لحاظ سے نبی عام ہے اور رسول خاص، وہ فرق یہ ہیں :

(۱) جس پر اللہ کی طرف سے وحی آتی ہو اور اسے تبلیغ کا حکم نہیں دیا گیا ہو، وہ نبی ہے، اور جس کو تبلیغ کا بھی حکم دیا گیا ہو، وہ رسول ہے۔

(۲) جس کو نئی شریعت نہیں دی گئی ہو، جو شریعت پہلے سے موجود تھی، اسی پر عمل کی دعوت کے لئے اسے مبعوث کیا گیا ہو، وہ نبی ہے اور نئی شریعت بھی دی گئی ہو تو وہ رسول ہے۔

(۳) جس پیغمبر کو کفار و مشرکین اور دین حق کے مخالفین کی طرف بھیجا گیا ہو، وہ رسول ہے، اور جو مخالفین کی طرف نہ بھیجا گیا ہو، وہ نبی ہے۔

اس آخری بات کی تائید قرآن کے بیان سے بھی ہوتی ہے؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

- كَذٰلِكَ مَآ اَتَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا قَالُوْا سَاحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ ۔ (الذاریات:۵۲)
- مَا يُقَالُ لَكَ اِلَّا مَا قَدْ قِيْلَ لِلرُّسُلِ مِنْ قَبْلِكَ ۔ (۱)

تمام انبیاء پر ایمان

انبیاء پر ایمان کا مطلب یہ ہے کہ ہم تمام انبیاء کے اللہ کی طرف سے نبی ہونے کا

(۱) فصلت:۴۳۔

یقین رکھیں، اگر کوئی شخص رسول اللہ ﷺ پر ایمان رکھے اور کسی بھی ایک نبی — جس کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہو — کا انکار کردے تو وہ مومن نہیں ہوسکتا، جن انبیاء کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے، ان کی شخصیت پر بالتعیین ایمان رکھنا ضروری ہے اور جن پیغمبروں کے نام قرآن مجید میں ذکر نہیں کئے گئے ہیں، ان پر اجمالی ایمان رکھنا ضروری ہے، یعنی یہ عقیدہ رکھا جائے کہ اللہ کی طرف سے جتنے انبیاء آئے، جس قوم میں آئے اور جس زبان میں ان پر آسمانی کتابیں نازل ہوئیں، ہم ان پر ایمان رکھتے ہیں؛ چنانچہ ارشاد ہے :

وَ رُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَ رُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ ۔ (نساء: ۱۶۴)

البتہ جن شخصیات کا ذکر بحیثیت نبی قرآن میں نہیں آیا ہے؛ لیکن ان کی تعلیمات میں توحید، آخرت اور عمل صالح کا ذکر آتا ہے اور ان کی تعلیمات سابق انبیاء کی تعلیمات سے ملتی جلتی ہیں جیسا کہ ہندو برادران وطن کے بعض بزرگوں کی تعلیمات ہیں، ان کے بارے میں بدرجۂ امکان یہ بات تو کہی جاسکتی ہے کہ شاید وہ اپنے زمانہ میں نبی رہے ہوں اور ان کی بعض ہدایات کو لوگوں نے بدل دیا ہو، نیز ان کا ذکر تو احترام کے ساتھ کیا جائے گا؛ لیکن ان کو نبی قرار دینا درست نہیں ہوگا؛ کیوں کہ ایمان لانے کا حکم ان چیزوں پر ہے جو یقینی طور پر ثابت ہوں، ایسی چیزوں پر نہیں جن کا ثبوت یقینی نہ ہو؛ بلکہ امکان کے درجہ میں ہو۔

قرآن مجید میں کل (۲۵) پچیس انبیاء کرام کا ذکر آیا ہے، ذیل میں ان کے نام اور کتنی بار صراحت کے ساتھ ان کے نام ذکر کئے گئے ہیں، لکھے جاتے ہیں :

۱-	حضرت آدم علیہ السلام	:	۲۵	بار
۲-	حضرت نوح علیہ السلام	:	۴۳	بار
۳-	حضرت صالح علیہ السلام	:	۹	بار
۴-	حضرت لوط علیہ السلام	:	۲۷	بار
۵-	حضرت اسحاق علیہ السلام	:	۱۷	بار

۶-	حضرت ایوب علیہ السلام	:	۲۷	بار
۷-	حضرت یونس علیہ السلام	:	۴	بار
۸-	حضرت موسیٰ علیہ السلام	:	۱۳۶	بار
۹-	حضرت داؤد علیہ السلام	:	۱۶	بار
۱۰-	حضرت الیاس علیہ السلام	:	۲	بار
۱۱-	حضرت زکریا علیہ السلام	:	۷	بار
۱۲-	حضرت عیسیٰ علیہ السلام	:	۲۵	بار
۱۳-	حضرت ادریس علیہ السلام	:	۲	بار
۱۴-	حضرت ہود علیہ السلام	:	۱۰	بار
۱۵-	حضرت ابراہیم علیہ السلام	:	۶۹	بار
۱۶-	حضرت اسماعیل علیہ السلام	:	۱۲	بار
۱۷-	حضرت یعقوب علیہ السلام	:	۱۶	بار
۱۸-	حضرت ذوالکفل علیہ السلام	:	۲	بار
۱۹-	حضرت شعیب علیہ السلام	:	۱۱	بار
۲۰-	حضرت ہارون علیہ السلام	:	۱۹	بار
۲۱-	حضرت سلیمان علیہ السلام	:	۱۷	بار
۲۲-	حضرت یسع علیہ السلام	:	۲	بار
۲۳-	حضرت یحییٰ علیہ السلام	:	۵	بار
۲۴-	حضرت یوسف علیہ السلام	:	۲۷	بار
۲۵-	حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم	:	۴	بار

قرآن مجید میں اگرچہ صراحتاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اسم گرامی چار جگہ ''محمد'' کے لفظ سے اور ایک جگہ ''احمد'' کے لفظ سے آیا؛ لیکن نام کی صراحت کے بغیر سینکڑوں جگہ آیا ہے؛ کیوں کہ

بہت سی آیات میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو مخاطب بنایا ہے، بہت سی جگہ آپ کے کسی قول یا فعل کو ذکر فرمایا گیا ہے، بعض دفعہ کفار ومشرکین آپ پر جو معاندانہ الزام لگاتے تھے، ان کی بات پر رد فرمایا گیا ہے، ان سب میں اسم ضمیر یا حاصلِ مضمون کے طور پر آپ کا ذکر خیر آیا ہے۔



انبیاء کی بعض خصوصیات

۱- عصمت

انبیاء کو پوری اُمت کے لئے نمونہ بنا کر بھیجا گیا ہے کہ وہ اپنی پوری زندگی میں ان کے طریقہ کو اختیار کریں؛ اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان کو معصوم بنایا ہے، عصمت کی تعریف اہل علم نے اس طرح کی ہے :

هی ملكة إلهية تمنع الإنسان من فعل المعصية والميل إليها مع القدرة عليها ـ(۱)

انسان جو غلطیاں کرتا ہے، وہ تین طرح کی ہیں : کبائر (بڑے گناہ)، صغائر (چھوٹے گناہ)، زلات (لغزشیں)، انبیاء ان میں سے کن باتوں سے معصوم ہوتے ہیں؟ اس میں فرق باطلہ کا اختلاف تو ہے ہی، اہل سنت والجماعت کے درمیان بھی اختلاف رائے ہے؛ علامہ بزدویؒ نے اہل سنت والجماعت کا مسلک اس طرح نقل کیا ہے، جو راجح ہے :

قال أهل السنة والجماعة : إن الأنبياء والرسل معصومون من الكبائر من الذنوب والصغائر بطريق القصد ، أما الزلات فغير معصومين عنها ، وهو ما يقع من الذنوب منهم خطأً أو نسياناً ـ(۲)

انبیاء سے پیش آنے والی مختلف لغزشوں کا خود قرآن مجید میں ذکر آیا ہے؛ چنانچہ :

☆ حضرت آدم علیہ السلام کے بارے میں فرمایا گیا :

عَصٰٓی اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰی ـ (طٰہٰ:۱۲۱)

(۱) اُصول الدین عند الامام ابی حنیفہ:۱۴۸۰ـ (۲) عصمۃ الانبیاء للرازی:۶۲ـ

☆ حضرت داؤد علیہ السلام کے بارے میں قرآن نے نقل کیا ہے :

قَالَ لَقَدْ ظَلَمَكَ بِسُؤَالِ نَعْجَتِكَ اِلٰى نِعَاجِهٖ وَ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْخُلَطَآءِ لَيَبْغِيْ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ قَلِيْلٌ مَّا هُمْ وَ ظَنَّ دَاوٗدُ اَنَّمَا فَتَنّٰهُ فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهٗ وَ خَرَّ رَاكِعًا وَّ اَنَابَ ، فَغَفَرْنَا لَهٗ ذٰلِكَ وَاِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا لَزُلْفٰى وَ حُسْنَ مَاٰبٍ ۔ (صٓ:۲۴-۲۵)

☆ حضرت یونس علیہ السلام سے اپنی اُمت کے سلسلہ میں جو اجتہادی لغزش پیش آئی، قرآن نے اس کا بھی ذکر کیا ہے، اور ان کے توبہ واعتراف کو نقل فرمایا ہے :

لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۔ (انبیاء:۸۷)

☆ رسول اللہ ﷺ ایک موقع پر ان شاء اللہ کہنا بھول گئے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر تنبیہ فرمائی گئی :

وَ لَا تَقُوْلَنَّ لِشَایْءٍ اِنِّيْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ، اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِيْتَ وَ قُلْ عَسٰٓى اَنْ يَّهْدِيَنِ رَبِّيْ لِاَقْرَبَ مِنْ هٰذَا رَشَدًا ۔ (۱)

صغائر کے ارتکاب کے سلسلہ میں ایک اور وضاحت ضروری ہے، جو علامہ ابن تیمیہؒ نے جمہور کے نقطۂ نظر کی حیثیت سے پیش کیا ہے، وہ فرماتے ہیں :

والجمهور الذين يقولون بجواز الصغائر عليهم يقولون : إنهم معصومون من الإقرار عليها ۔ (۲)

یعنی انبیاء سے جو بھی چوک ہوتی ہے، وہ اس پر قائم نہیں رہتے ۔

۲- دعوت توحید

انبیاء کا بنیادی کام انسانیت کو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی طرف دعوت دینا ہے؛ چنانچہ ارشاد خداوندی ہے :

---

(۱) کہف:۲۳-۲۴، نیز دیکھئے: التفسیر المنیر:۱۵/۲۱۵۔ (۲) منہاج السنۃ النبویۃ:۲/۴۰۰۔

وَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ
اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ۔ (انبیاء:۲۵)

۳- اطاعت وفرمانبرداری

ہر نبی کا اس کی اُمت پر حق ہے کہ اس کی اطاعت وفرمانبرداری کی جائے: ''وَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ'' (نساء:۶۴) بلکہ رسول چوں کہ اللہ ہی کا پیغام پہنچاتا ہے؛ اس لئے اس کی اطاعت اللہ ہی کی اطاعت ہے :

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۔ (نساء:۸۰)

۴- بشریت

نبی ورسول بھی بشر ہی ہوتے ہیں؛ البتہ ان پر اللہ کی طرف سے وحی نازل ہوتی ہے، یہ کہنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا کوئی اور نبی بشر نہیں تھے، درست نہیں ہے، اکثر انبیاء کی اُمتوں نے اسی لئے ایمان لانے سے انکار کیا کہ نبی بھی ایک انسان ہیں :

قَالُوْٓا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَصُدُّوْنَا
عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا ۔ (ابراہیم:۱۰)

خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہلایا گیا :

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ
وَّاحِدٌ ۔ (کہف:۱۱۰)

فقہاء نے بھی یہ بات لکھی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بشریت کو تسلیم کرنا ضروری ہے؛ چنانچہ علامہ ولی الدین عراقیؒ سے سوال کیا گیا :

هل العلم بكونه صلى الله عليه وسلم بشرا ومن
العرب شرط فی صحة الإيمان أو من فروض الكفاية ۔

تو انھوں نے جواب دیا :

إنه شرط صحة الإيمان ثم قال : فلو قال شخص :

أومن برسالة محمد صلى الله عليه وسلم إلى جميع الخلق لكن لا أدرى هل هو من البشر أو من الملائكة أو من الجن أو لا أدرى هل هو من العرب أو من العجم ؟ فلا شك فى كفره لتكذيبه القرآن وجحده ما تلقته قرون الإسلام خلفا عن السلف وصار معلوما بالضرورة ۔ (۱)

علامہ ابن ہمامؒ اہل سنت والجماعۃ کے عقائد کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

النبى إنسان بعثه الله لتبليغ ما أوحى إليه وكذا الرسول ۔ (۲)

علامہ نسفیؒ فرماتے ہیں :

وقد أرسل الله تعالىٰ رسلاً من البشر إلى البشر مبشرين لأهل الإيمان والطاعة بالجنة والثواب ومنذرين لأهل الكفر والعصيان بالنار والعقاب ۔ (۳)

حقیقت یہ ہے کہ انبیاء کا بشر ہونا ضروری تھا؛ کیوں کہ نبی انسانیت کے لئے نمونۂ عمل ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے؛ جب کہ اس میں بشری ضرورتیں اور انسان کو بحیثیت انسان پیش آنے والے مختلف حالات پیش آتے ہوں، اگر فرشتہ یا کسی اور مخلوق کو نبی بنایا جاتا تو یہ مقصد حاصل نہیں ہو پاتا۔

اسی لئے اگر چہ انبیاء گناہ سے معصوم ہیں؛ لیکن بشری ضرورتیں اور تقاضے ان کے اندر بھی پائے جاتے ہیں، جیسے: بھوک، پیاس، طبعی حالات، بیماری، نیند، کسی اچھی بات سے خوش ہونا، تکلیف دہ بات سے رنجیدہ ہونا، اولاد کی محبت وغیرہ، ان ہی بشری صفات میں سے ایک

(۱) روح المعانی: ۲/ ۳۲۵۔

(۲) المسایرۃ فی علم الکلام: ۱۲۷۔

(۳) شرح عقائد نسفی: ۱۳۳۔

سہو ونسیان بھی ہے ؛ چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا : ''إنما أنا بشر مثلکم أنسی کما تنسون فإذا نسیت تذکرونی '' (۱) جیسے ایک بار آپ ﷺ کو نماز میں سہو پیش آیا اور حضرت ذوالیدینؓ نے اس کی طرف توجہ دلائی ، (۲) حضرت خضر علیہ السلام کے ساتھ سفر کرتے ہوئے حضرت موسیٰ علیہ السلام مچھلی کے زندہ ہوکر پانی میں جانے کا تذکرہ کرنا بھول گئے ، (الکہف: ۶۰-۶۸) حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت خضر علیہ اسلام سے وعدہ کیا کہ اب کوئی سوال نہیں کروں گا ؛ لیکن پھر سوال کرگزرے ، (الکہف: ۷۱) اسی طرح رسول اللہ ﷺ کی نماز نیند کے غلبہ کی وجہ سے فوت ہوگئی اور آپ نے اس کی قضا فرمائی ۔ (۳)

البتہ انبیاء سے تبلیغ دین کے معاملہ میں سہو ونسیان نہیں ہوسکتا ؛ کیوں کہ اگر ایسا ہوتو اس کا لایا ہوا دین پورا کا پورا مشکوک ہوجائے گا ، ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ حکمت الٰہی کے تحت اس کے ذاتی فعل میں بھول ہوگئی ہو ؛ کیوں کہ اس بھول کی وجہ سے اُمت کو سجدہ سہو کا حکم اور اس کا طریقہ معلوم ہوا ، باجماعت نماز فوت ہوجانے کی وجہ سے چھوٹی ہوئی نماز کو ادا کرنے کا حکم معلوم ہوا ۔

ان ہی بشری خصوصیات میں یہ ہے کہ جیسے دوسرے انسانوں کو جسمانی تکلیف پہنچائی جاسکتی ہے ، اس کو زخمی یا قتل کیا جاسکتا ہے یا اس پر جادو کا اثر ہوسکتا ہے ، اسی طرح نبی کو بھی تکلیف پہنچائی جاسکتی ہے ؛ چنانچہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کو قتل کردیا گیا ، رسول اللہ ﷺ زخمی کردیئے گئے ، آپ پر مدینہ میں ایک یہودی نے سحر کیا اور اسی سلسلہ میں آپ پر معوذتین نازل ہوئیں ، (۴) یہ نبوت کے منافی نہیں ہیں ؛ البتہ نبی پر سحر کا ایسا اثر نہیں ہوسکتا جس سے کار نبوت میں خلل پڑجائے ۔

۵- عبدیت

انبیاء اپنے تمام کمالات اور اللہ سے قربت کے باوجود اللہ کے بندہ ہی ہوتے ہیں ؛

(۱) بخاری ، حدیث نمبر: ۴۰۱ ۔ (۲) صحیح مسلم ، باب السھو فی الصلاۃ ، حدیث نمبر: ۵۷۳ ۔
(۳) مسند بزار ، حدیث نمبر: ۹۷۶۶ ۔ (۴) مسند عبد بن حمید ، حدیث نمبر: ۲۷۱ ۔

بلکہ ان کی زندگی عبدیت اور بندگی کا اعلیٰ ترین نمونہ ہوتی ہے، نہ وہ فرشتہ ہوتا ہے اور نہ اس کو خدا کی طرح کائنات میں تصرف کا اختیار ہوتا ہے؛ اسی لئے قرآن مجید میں مختلف انبیاء کا ذکر کرتے ہوئے خاص طور پر ان کے ''عبد الٰہی'' ہونے کا ذکر کیا گیا ہے؛ چنانچہ حضرت ایوب علیہ السلام کے بارے میں ارشاد ہوا :

وَاذْكُرْ عَبْدَنَآ اَيُّوْبَ ۔ (صٓ:۴۰)

ایک موقع پر کئی انبیاء کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہے :

وَاذْكُرْ عِبٰدَنَآ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ اُولِى الْاَيْدِىْ وَالْاَبْصَارِ ۔ (صٓ:۴۵)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کے بارے میں عیسائیوں کو دھوکہ ہوا اور وہ آپ کو خدا قرار دینے لگے، اس پس منظر میں فرمایا گیا :

اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَيْهِ وَ جَعَلْنٰهُ مَثَلًا لِّبَنِىٓ اِسْرَآءِيْلَ ۔ (زخرف:۵۹)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو معراج عطا فرمائی گئی، اس علو مقام کی وجہ سے کم فہم لوگوں کو خیال ہوسکتا تھا کہ آپ عبدیت سے ماوراء ہیں، تو اس واقعہ کو ذکر کرتے ہوئے خاص طور پر آپ کے عبد ہونے کی صراحت فرمائی گئی :

سُبْحٰنَ الَّذِىٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا ۔ (بنی اسرائیل:۱)

عبادت اور دعاء عبدیت کا مظہر ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کے عبادت کرنے اور دُعاء کرنے کا پوری وضاحت کے ساتھ ذکر فرمایا دیا ہے؛ چنانچہ حضرت زکریا علیہ السلام نے اولاد کے لئے دُعاء کی، (آل عمران: ۳۸-۴۰) اور حضرت آدم علیہ السلام نے اپنے لئے عفو ودرگزر کی دُعاء فرمائی، (بقرہ:۳۷) اسی طرح اکثر انبیاء کی دُعائیں قرآن مجید میں نقل کی گئی ہیں۔

۶- منصب نبوت وہبی ہے نہ کہ کسبی

نبوت کا تعلق کسب سے نہیں ہے، یعنی جب نبوت کا سلسلہ جاری تھا، تب بھی ایسا نہیں

تھا کہ ایک شخص اپنی صلاحیت اور عبادت کے ذریعہ ترقی کرتے کرتے نبی ہوجائے؛ بلکہ یہ خالصتاً اللہ تعالیٰ کا انتخاب ہے؛ چنانچہ ارشاد ہے :

اَللّٰهُ يَصْطَفِىْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّ مِنَ النَّاسِ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ۔ (حج:۷۵)

انبیاء کے مخاطب بعض دفعہ اعتراض کرتے کہ تم ہماری ہی طرح انسان ہو، انسانی ضرورتیں تمہارے ساتھ بھی لگی ہوئی ہیں ، اور دولت وسرداری کے اعتبار سے بھی ہم سے بڑے نہیں ہو، پھر اللہ نے اپنی نبوت کے لئے تمہارا انتخاب کیوں فرمایا؟ اللہ تعالیٰ نے اس کا جواب دیا :

قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۔ (ابراہیم:۱۱)

ایک اور موقع پر ارشاد ہوا :

اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ ۔ (انعام:۱۲۴)

اسی لئے نبی کو خود بھی اس کی خبر نہیں ہوتی تھی کہ اسے نبوت کی ذمہ داری ملنے والی ہے، قرآن مجید میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ وہ تو آگ سمجھ کر آگے بڑھے، مگر جب قریب پہنچے تو ان پر وحی نازل ہوئی :

فَلَمَّا قَضٰى مُوْسَى الْاَجَلَ وَ سَارَ بِاَهْلِهٖٓ اٰنَسَ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ نَارًا قَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْٓا اِنِّیْٓ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّیْٓ اٰتِيْكُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ اَوْ جَذْوَةٍ مِّنَ النَّارِ لَعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ ، فَلَمَّآ اَتٰىهَا نُوْدِیَ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ الْاَيْمَنِ فِی الْبُقْعَةِ الْمُبٰرَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ اَنْ يّٰمُوْسٰٓى اِنِّیْٓ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۔ (قصص:۲۹-۳۰)

اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غار حرا میں تھے، جب حضرت جبرئیل علیہ السلام آئے اور پہلی وحی نازل فرمائی تو آپ گھبرا گئے اور اسی حالت میں اپنے دولت خانہ کو واپس ہوئے،

حضرت خدیجہؓ نے آپ کو تسلی دی، اور پھر حضرت ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں، تب آپ ﷺ کو اطمینان ہوا۔(۱)

معجزہ

انبیاء چوں کہ عام انسانوں کی طرح ایک انسان ہوتے ہیں؛ اس لئے جب وہ اللہ کی طرف سے نبی ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں تو اپنے مدعو کو مطمئن کرنے کے لئے ان کے سامنے کوئی ایسی چیز پیش کرنی پڑتی ہے، جس کو پیش کرنے سے اس کے مخاطب عاجز ہوں، اسی کو معجزہ کہتے ہیں :

المعجزة أثر تظهر بخلاف العادة على يدى مدعى النبوة مع تحديه قومه بها ومع عجز قومه عن معارضيه لمثلها ۔ (۲)

لہٰذا معجزہ سے مراد نبوت کا دعویٰ کرنے والوں کے ہاتھوں پر کسی سبب ظاہری کے بغیر ایسے خارق عادت امور کا ظاہر ہونا ہے جو انسان کی طاقت سے باہر ہو؛ اس لئے یہ یقین کرنا بھی انبیاء پر ایمان میں داخل ہے کہ انبیاء کے معجزات حق ہیں۔

قرآن مجید میں مختلف انبیاء کے معجزات ذکر کئے گئے ہیں؛ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے دربار میں دو معجزات پیش فرمائے :

قَالَ اِنْ كُنْتَ جِئْتَ بِاٰيَةٍ فَاْتِ بِهَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ، فَاَلْقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ ، وَّ نَزَعَ يَدَهٗ فَاِذَا هِيَ بَيْضَآءُ لِلنّٰظِرِيْنَ ۔ (اعراف:۱۰۶-۱۰۸)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوا :

اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِيْ عَلَيْكَ وَعَلٰى وَالِدَتِكَ اِذْ اَيَّدْتُّكَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ تُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَ كَهْلًا وَ اِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ التَّوْرٰىةَ

(۱) صحیح البخاری، باب بدء الوحی، حدیث نمبر:۳۔ (۲) الفرق بین الفرق:۳۳۳۔

وَالۡاِنۡجِيۡلَ وَ اِذۡ تَخۡلُقُ مِنَ الطِّيۡنِ كَهَيۡـئَةِ الطَّيۡرِ بِاِذۡنِىۡ فَتَنۡفُخُ فِيۡهَا فَتَكُوۡنُ طَيۡرًاۢ بِاِذۡنِىۡ وَ تُبۡرِئُ الۡاَكۡمَهَ وَالۡاَبۡرَصَ بِاِذۡنِىۡ وَ اِذۡ تُخۡرِجُ الۡمَوۡتٰى بِاِذۡنِىۡ وَ اِذۡ كَفَفۡتُ بَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ عَنۡكَ اِذۡ جِئۡتَهُمۡ بِالۡبَيِّنٰتِ فَقَالَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا مِنۡهُمۡ اِنۡ هٰذَاۤ اِلَّا سِحۡرٌ مُّبِيۡنٌ ۔ (مائدہ:۱۱۰)

اسی طرح قرآن مجید میں متعدد پیغمبروں کے معجزات ذکر کئے گئے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی متعدد معجزات دیئے گئے ہیں، جیسے روم و ایران کے بارے میں پیشین گوئی یا فتح مکہ کی پیشین گوئی، جن کا ذکر قرآن مجید میں موجود ہے، حدیث میں بھی مختلف معجزات کا ذکر آیا ہے؛ لیکن سب سے بڑا معجزہ قرآن مجید ہے، قرآن نے چیلنج کیا کہ اگر تم اس کتاب کو اللہ کی طرف سے نہیں سمجھتے تو ایسی ہی ایک کتاب لے آؤ، (اسراء:۸۸) پھر فرمایا گیا کہ اگر پورا قرآن نہ لاسکو تو دس سورتیں ہی لے آؤ، (ہود:۱۳) جب وہ اس کا بھی جواب نہیں دے سکے تو قرآن نے کہا :

وَ اِنۡ كُنۡتُمۡ فِىۡ رَيۡبٍ مِّمَّا نَزَّلۡنَا عَلٰى عَبۡدِنَا فَاۡتُوۡا بِسُوۡرَةٍ مِّنۡ مِّثۡلِهٖ وَ ادۡعُوۡا شُهَدَآءَكُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ۔ (بقرہ:۲۳)

قرآن کے اس چیلنج کو قبول کرنے کا محرک بھی موجود تھا؛ کیوں کہ اہل مکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نبی ہونے کا انکار کرتے تھے اور آپ کی مخالفت میں انھوں نے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی، حالاں کہ یہ بات ان کے لئے بہت آسان تھی کہ وہ اس چیلنج کو قبول کرتے ہوئے لوگوں کو قرآن مجید پر ایمان لانے سے روکتے، اس چیلنج کے قبول کرنے میں کوئی مانع بھی نہیں تھا؛ کیوں کہ ان کی زبان بھی عربی تھی اور وہ اپنی فصاحت و بلاغت اور زبان و بیان پر ناز کرتے تھے، مگر وہ اس چیلنج کا جواب نہیں دے سکے، اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ قرآن مجید کا معجزہ ہے۔

انبیاء کو معجزات ان کے زمانہ کے لحاظ سے عطا کئے گئے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں سحر اور جادوگری کا غلبہ تھا؛ اس لئے ان کو ایسا معجزہ عطا فرمایا گیا کہ جادو کے ذریعہ اس

کا جواب دینے سے ان کی قوم قاصر ہوگئی، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے عہد میں طب وعلاج کی طرف لوگوں کی توجہ تھی، تو انھیں اسی انداز کا معجزہ دیا گیا، جیسے: نابینا کا بینا ہونا، یا مُردہ کا زندہ ہوا اُٹھنا، رسول اللہ ﷺ جس معاشرہ میں پیدا ہوئے، اس کو اپنی زبان وبیان پر ناز تھا اور وہ اپنے مقابلہ میں پوری دنیا کو گونگا تصور کرتے تھے؛ اسی لئے آپ کو قرآن مجید کی شکل میں ایک دائمی معجزہ عطا فرمایا گیا۔

زمانہ کے لحاظ سے معجزہ عطا کئے جانے کی طرف حدیث میں بھی اشارہ آیا ہے؛ چنانچہ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا :

ما من الأنبياء نبي إلا أعطى ما مثله ، آمن عليه البشر ، و إنما كان الذي أوتيت وحيا أوحاه الله إلي ، فأرجو أن أكون أكثرهم تابعاً يوم القيامة ۔ (۱)

البتہ معجزات کے ظاہر ہونے میں نبی کے ارادہ یا طاقت کا کوئی دخل نہیں ہوتا تھا، یہاں تک کہ اکثر دفعہ انبیاء کو خود اس بات کی اطلاع نہیں ہوتی تھی کہ اللہ تعالیٰ ان کے ہاتھوں پر کوئی معجزہ ظاہر کرنے والے ہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالا گیا اور وہ آگ ٹھنڈی ہوگئی، حضرت موسیٰ علیہ اسلام کو ید بیضاء اور سانپ بن جانے والا عصا عطا کیا گیا، رسول اللہ ﷺ کو سفر معراج پر لے جایا گیا، قرآن کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ خود ان انبیاء کرام کو پہلے سے اس کی خبر نہیں تھی؛ چنانچہ متعدد مواقع پر انبیاء کی زبان سے یہ بات کہلائی گئی ہے کہ معجزہ لانا ہمارے اختیار میں نہیں ہے، مثلاً ارشاد ہے :

وَ مَا كَانَ لَنَآ اَنْ نَّاْتِيَكُمْ بِسُلْطٰنٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۔ (ابراھیم:۱۱)

مادہ پرست حضرات معجزات کے قائل نہیں ہیں، ان کا خیال ہے کہ کائنات میں کوئی چیز خلافِ عادت نہیں ہوسکتی، آگ کا کام جلانا ہے اور پانی کا کام وزنی چیزوں کو ڈبونا ہے، تو یہ

(۱) صحیح البخاری، حدیث نمبر: ۴۹۸۱۔

کیسے ممکن ہے کہ آگ جلانا چھوڑ دے اور پانی کی فطرت میں جو ڈبونے کی صلاحیت رکھی گئی ہے، وہ بدل جائے؟ بعض مسلمان دانشور بھی ان کی اس دلیل سے متاثر ہوجاتے ہیں، وہ قرآن سے بھی اس دعویٰ کا جواز تلاش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''وَ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا''۔(الفتح:۲۳)

لیکن یہ غلط ہے، مخلوق کی عادت اللہ کی بنائی ہوئی ہے، اور صانع اپنی مصنوعات میں تبدیلی کرسکتا ہے، ہم لوگ دنیا میں شب و روز اس کی مثالیں دیکھتے رہتے ہیں؛ اس لئے معجزات مخلوق کے لحاظ سے خارق عادت ہیں، مخلوق خود اس میں کوئی تبدیلی نہیں لاسکتی؛ لیکن اللہ تعالیٰ اگر اس میں تبدیلی لائیں تو اس میں کوئی استحالہ نہیں ہے، اور قرآن نے جو اللہ تعالیٰ کی سنت کے تبدیل نہ ہونے کی بات فرمائی گئی ہے، اس میں خالق کی عادت کا ذکر ہے نہ کہ مخلوق کی عادت کا، اللہ تعالیٰ اپنی سنت کو تبدیل نہیں فرماتے، جیسے نیکی پر جزاء، یہ اللہ تعالیٰ کی سنت ہے، اس میں اللہ کوئی تبدیلی نہیں فرماتے؛ لیکن مخلوق کے لئے عام حالات میں جو شکل بنائی گئی ہے، خدائے قادر مطلق اس میں ضرور تبدیلی کرسکتا ہے۔

کرامات

جیسے انبیاء کرام کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے بعض خارقِ عادت واقعات پیش آتے ہیں؛ اسی طرح اللہ کے نیک بندوں کے ذریعہ بھی بعض دفعہ خلافِ عادت واقعات ظاہر ہوتے ہیں، ان میں سے بعض کا ذکر تو خود قرآن مجید میں آیا ہے، جیسے حضرت سلیمان علیہ السلام کا تخت پلک جھپکنے سے پہلے ایک شخص کا لے آنا، (نمل:۳۸-۴۲) حضرت مریم علیہا السلام کا کسی مرد سے اتصال کے بغیر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ماں بننا اور ان کے سامنے بے موسم کے پھلوں کا موجود رہنا، (مریم:۲۳-۲۵) اگر حضرت خضر فرشتہ یا نبی نہ ہوں، صرف ولی ہوں تو ان کا مستقبل میں پیش آنے والے تکوینی واقعات سے واقف ہونا، (کہف:۶۵-۸۲) یا اصحابِ کہف کا تین سو سال تک سویا رہنا وغیرہ، (کہف:۲۵) اس لئے اولیاء کے ہاتھوں پر کرامات کا ظاہر ہونا حق ہے:

والکرامات للأولیاء حق۔ (الفقہ الاکبر:۷۹)

البتہ انبیاء کے معجزات اکثر تحدی (چیلنج) کے ساتھ ہوتے ہیں؛ کیوں کہ یہ ان کی نبوت کی دلیل ہوتی ہے، اور اللہ کی طرف سے ان کو اس کا علم ہوتا ہے، اور ولایت ایسی چیز نہیں ہے، جس کا دعویٰ کیا جائے اور اس پر ایمان لانا ضروری ہو؛ بلکہ یہ بھی ضروری نہیں کہ خود ولی کو اپنے مقام کی اطلاع ہو؛ اسی لئے معجزات صاحب معجزات کے نبی ہونے کی دلیل ہوتی ہے، کرامت دلیل ولایت نہیں ہے؛ کیوں کہ بعض بے دین لوگوں کے ہاتھ بھی بعض دفعہ خارقِ عادت اُمور ظاہر ہوتے ہیں، کسی شخص کی ولایت کے لئے اصل معیار ہے: شریعت کی اطاعت اور سنت کی اتباع۔

استدراج

بعض دفعہ اللہ تعالی کی قدرت اور ڈھیل کی وجہ سے کافر و فاسق لوگوں کے ہاتھ بھی خارقِ عادت اُمور ظاہر ہوجاتے ہیں، جو زیادہ تر سحر، جادو، اور شعبدہ بازی کے ذریعہ ہوتا ہے، اس کو 'استدراج' کہتے ہیں، خود حدیث میں دجال کے سلسلہ میں یہ بات آئی ہے کہ اس کے پاس جنت و دوزخ ہوگی اور وہ ایک انسان کو مار کر زندہ کر دے گا؛ البتہ نبی کے معجزات کے مقابلہ استدراج کامیاب نہیں ہوسکتا جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات کے مقابلہ ساحروں کا سحر بے اثر ہوگیا تھا:

ما لا يكون مقرونا بالإيمان والعمل الصالح يكون استدراجاً سواء صدر عن كافر أو عن مؤمن فاسق۔ (۱)

تمرینی سوالات

(۱) انسان کو نبی کی تعلیمات کی ضرورت کیوں ہے؟

(۲) نبی کی تعریف کیجئے؟

(۳) نبی اور رسول میں کیا فرق ہے؟

---

(۱) نبراس: ۲۹۶۔

(۴) قرآن مجید میں کتنے انبیاء کے صراحتاً نام ذکر کئے گئے ہیں۔

(۵) انبیاء کی ایک خصوصیت معصوم ہونا ہے، اس سے کیا مراد ہے؟

(٦) بعض حضرات نبی کو بشر نہیں مانتے، کیا یہ نقطۂ نظر درست ہے؟

(۷) منصب نبوت کے وہبی ہونے سے کیا مراد ہے؟

(۸) معجزہ سے کیا مراد ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعض معجزات کا ذکر کیجئے؟

(۹) کرامت اور استدراج کا فرق بتایئے اور قرآن مجید سے کرامات کے ممکن ہونے کا ثبوت پیش کیجئے۔

نبوتِ محمدی

اللہ تعالیٰ نے ہر قوم میں اپنے نبی بھیجے ہیں، بعض ضعیف حدیثوں میں ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء کی تعداد ذکر کی گئی ہے، (۱) پہلے نبی حضرت سیدنا آدم علیہ السلام تھے، جو پہلے انسان اور پوری انسانیت کے جد امجد تھے، نبوت کا یہ سلسلہ جناب محمد عربی پر مکمل ہو گیا؛ اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت پر ایمان لانا ایمان کا بنیادی حصہ ہے، اگر کوئی آپ سے پہلے کے پیغمبروں پر ایمان رکھتا ہو، اور آپ پر ایمان نہیں رکھتا ہو تو وہ مومن نہیں ہوسکتا، جیسے: یہود و نصاریٰ، اسی طرح اگر کوئی شخص آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بلند پایہ مفکر، عظیم مصلح، قابل حکمراں اور انقلابی شخصیت مانتا ہو، جیسا کہ بہت سے مستشرقین یا دنیا کے دوسرے مفکرین کہتے ہیں؛ لیکن آپ کو نبی تسلیم نہیں کرتا ہو، تو وہ صاحبِ ایمان نہیں ہوسکتا۔

دلیلِ نبوت

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نبی ہونے کی دلیل یہ ہے کہ :

● آپ کی صدق وراستی اور امانت و دیانت تمام اہل مکہ کو تسلیم تھی، یہاں تک کہ لوگ آپ کو صادق اور امین کہا کرتے تھے؛ چنانچہ آپ پر سب سے پہلے وہ لوگ ایمان لائے جو

---

(۱) مسند احمد، حدیث نمبر: ۲۲۲۸۸۔

آپ ﷺ کے قریب ترین لوگ تھے اور آپ کے حالات سے بخوبی واقف تھے، جیسے: بیوی، جگری دوست، اور غلام، یہ آپ کے اپنے دعویٰ میں صادق ہونے کی دلیل ہے۔

● اگر کوئی انسان جھوٹ اور دھوکہ سے کام لیتا ہے تو اس کے تین ہی مقاصد ہو سکتے ہیں: اقتدار کا حصول، دولت کا حصول اور عورت کا حصول، آپ کو دعوتِ حق سے باز رکھنے کے لئے اہل مکہ نے ان تینوں چیزوں کی پیشکش کی، اگر نعوذ باللہ آپ جھوٹے مدعی نبوت ہوتے تو ضرور اس سے فائدہ اُٹھاتے؛ لیکن آپ نے ان تینوں چیزوں کی پیشکش کو مسترد فرما دیا۔(۱)

● اگر جزیرۃ العرب میں قریبی زمانہ میں کسی نے نبوت کا دعویٰ کیا ہوتا تو سوچا جا سکتا تھا کہ شاید آپ نے اس کی نقل کی ہو؛ لیکن ایسا بھی نہیں تھا، عرب کی سرزمین میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بعد کسی نے نبوت کا دعویٰ نہیں کیا، اور ان کا زمانہ آپ سے ہزاروں سال پہلے کا ہے۔

● پھر آپ ﷺ نے ایک ایسی کتاب پیش کی، جس کی مثال لانے کا بار بار اہل مکہ کو چیلنج دیا گیا اور وہ اہل زبان ہونے اور آپ سے سخت عناد رکھنے کے باوجود اس کا کوئی جواب نہیں دے سکے۔

● آپ ﷺ نے متعدد پیشین گوئیاں فرمائیں، جو اس وقت ناممکن محسوس ہوتی تھیں، جیسے: روم کی شکست فاش کے بعد دوبارہ ان کے فتحیاب ہونے کی پیشین گوئی، (روم: ۲، ۳) یا جس وقت آپ ﷺ مسلمانوں کے ساتھ بے سہارا ہو کر مکہ سے نکلنے پر مجبور ہوئے، اس وقت یہ پیشین گوئی کہ آپ ﷺ پھر مکہ واپس آئیں گے؛(۲) لیکن یہ پیشین گوئیاں حرف بہ حرف درست ثابت ہوئیں۔

یہ سب باتیں آپ کے دعویٰ نبوت کے درست اور سچ ہونے کی واضح دلیل ہیں۔



---

(۱) سیرت ابن ہشام: ۱/۲۶۶۔　(۲) شرح المشکوٰۃ للطیبی: ۶/۲۰۴۷، باب حرم مکہ حرسہا اللہ تعالیٰ۔

نبوتِ محمدی کی خصوصیات

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بحیثیت نبی بعض خصوصیات عطا فرمائی گئی ہیں :

۱- ختم نبوت

پہلی اور سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ آپ آخری نبی ہیں، آپ پر نبوت کا دروازہ بند کر دیا گیا ہے؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَ لٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ۔ (احزاب:۴۰)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو ایک مثال کے ذریعہ سمجھایا ہے :

مثلی ومثل الأنبياء ، كمثل رجل بنى بنيانا فأحسنه وأجمله إلا موضع لبنة من زاوية من زواياه فجعل الناس يطوفون به ، ويعجبون له ، ويقولون هلا وضعت هذه اللبنة قال : فأنا اللبنة وأنا خاتم النبيين ۔ (۱)

آپ پر نبوت ختم ہو جانے کے سلسلہ میں ڈھیر ساری حدیثیں مروی ہیں، جو تواتر کے درجہ کو پہنچی ہوئی ہیں، خاتم النبیین کے معنی یہ ہیں کہ سلسلہ نبوت کو آپ کے بعد بند کر دیا گیا ہے، آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آ سکتا، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خاتم النبیین کے مفہوم کو واضح کرتے ہوئے فرمایا :

الا أنه لا نبی بعدی أنا خاتم النبيين لا نبی بعدی ۔ (۲)

(۱) السنن الکبریٰ للنسائی، حدیث نمبر: ۱۱۳۵۸۔ (۲) سنن ابی داؤد، باب ذکر الفتن ولائلھا، حدیث نمبر: ۴۲۵۲۔

آپ ﷺ کے بعد کسی بھی طرح کی نبوت باقی نہیں رہی، آپ نے حضرت عمرؓ کے بارے میں فرمایا :

لو كان بعدي نبيا لكان عمر ۔ (۱)

اور جب آپ ﷺ حضرت علیؓ کو غزوۂ تبوک کے موقع سے مدینہ میں چھوڑ کر تشریف لے گئے تو حضرت علیؓ سے فرمایا :

أنت مني بمنزلة هارون من موسى ۔ (۲)

تو اگر کسی درجہ کی نبوت باقی رہتی تو حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ کو نبوت مل سکتی تھی، مگر ایسا نہیں ہوا؛ لہٰذا آپ ﷺ کے بعد کسی طرح کی نبوت باقی نہیں رہی، نہ تشریعی اور نہ غیر تشریعی۔

یہاں تک کہ امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا کہ آپ ﷺ کے بعد کسی مدعی نبوت سے معجزہ طلب کرنا بھی کفر ہے :

من طلب منه علامة فقد كفر لقوله صلى الله عليه وسلم : لا نبي بعدي . . . ۔ (۳)

غرض اس پر اُمت کا اجماع ہے کہ آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آسکتا اور جو نبوت کا دعویٰ کرے، وہ جھوٹا اور کافر ہے، اور جو ایسے شخص کی تصدیق کرے، وہ بھی کافر ہے، لہٰذا :

(الف) رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے میں یہ بات داخل ہے کہ وہ نبی ہونے کے ساتھ ساتھ آپ کے آخری نبی ہونے کا اقرار کرتا ہو، اگر کوئی شخص آپ کو نبی تسلیم کرتا ہو؛ لیکن آخری نبی نہیں مانتا ہو، آپ کے بعد کسی اور نبی کی آمد کا عقیدہ رکھتا ہو، یا کسی اور مدعی نبوت کو سچا جانتا ہو، وہ مسلمان نہیں ہے۔

(ب) مرزا غلام احمد قادیانی جس نے نبی ہونے کا اور مسیح و مہدی ہونے کا دعویٰ کیا ہے

---

(۱) المعجم الکبیر للطبرانی، حدیث نمبر: ۸۲۲۔

(۲) صحیح مسلم، باب من فضائل علی بن ابی طالب، حدیث نمبر: ۲۴۰۴۔

(۳) روح البیان: ۷/۱۸۸۔

اوراس کے علاوہ بھی کئی عجیب وغریب دعوے کئے ہیں، وہ بھی اوراس کی تصدیق کرنے والے بھی کافر ہیں، قادیانیوں کالاہوری گروپ بھی اس میں شامل ہے؛ کیوں کہ وہ ایک کذاب مدعی نبوت کومجدد اور مہدی مانتا ہے۔

(ج) ایران میں ایک فرقہ بابی ہے، جو سید علی محمد باب (۱۸۲۰-۱۸۵۰ء) کو نبی مانتا ہے، یہ بھی کافر ہے؛ کیوں کہ یہ ختم نبوت کا منکر ہے۔

(د) ایران میں ایک فرقہ بہائی ہے، جو مرزا حسین علی نوری، معروف بہ: بہاء اللہ (۱۸۱۷-۱۸۹۲ء) کو نبی مانتا ہے، اس کے ماننے والے ہندوستان میں بھی پائے جاتے ہیں، یہ بہاء اللہ کے نبی ہونے اور اس کے اندر خدا کے حلول ہونے کے قائل ہیں، اس لئے یہ بھی کافر ہیں۔

۲- بعثت عامہ

رسول اللہ ﷺ سے پہلے جو نبی آئے، وہ ایک قبیلہ یا ایک علاقہ کی طرف مبعوث کئے گئے؛ چنانچہ قرآن مجید میں مختلف انبیاء کا ذکر اس طرح فرمایا ہے :

- اِنَّآ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِهٖٓ ۔ (۱)
- وَاِلٰی عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ۔ (۲)
- وَاِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۔ (۳)
- وَاِلٰی مَدْیَنَ اَخَاهُمْ شُعَیْبًا ۔ (۴)

لیکن رسول اللہ ﷺ کو تمام انسانیت کی طرف نبی بنا کر بھیجا گیا ہے، قرآن مجید میں متعدد مواقع پر اس کا ذکر موجود ہے :

- قُلْ یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ جَمِیْعًا ۔ (۵)
- وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّ نَذِیْرًا ۔ (۶)

---

(۱) نوح:۱۔ (۲) ہود:۵۰۔ (۳) اعراف:۷۳۔
(۴) اعراف:۸۵۔ (۵) اعراف:۱۵۸۔ (۶) سبا:۲۸۔

• وَ مَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ ۔ (۱)

اس مضمون کی اور بھی متعدد آیات موجود ہیں، قرآن اس بات کی بھی صراحت کرتا ہے کہ جولوگ آپ ﷺ کی زندگی میں موجود تھے، آپ کی بعثت صرف ان ہی کے لئے نہیں تھی؛ بلکہ آپ کے بعد والوں کے لئے بھی تھی :

وَ اُوْحِیَ اِلَیَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَ مَنْۢ بَلَغَ ۔ (۲)

نیز یہ کہ آپ ﷺ کی بعثت انسانوں کی طرح جنوں کی طرف بھی تھی، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

تَبٰرَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ لِیَكُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرَا ۔ (۳)

امام طحاویؒ نے امام ابوحنیفہؒ اور صاحبینؒ کا نقطہ نظر ان الفاظ میں بیان کیا ہے :

وهو المبعوث إلى عامة الجن وكافة الورى بالحق والهدى وبالنور والضياء ۔ (۴)

۳- افضل المخلوقات

اللہ تعالیٰ نے انبیاء میں بھی فرق مراتب رکھا ہے، اور بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے؛ چنانچہ آپ ﷺ کو تمام انبیاء پر فضیلت دی گئی ہے؛ لہٰذا آپ ﷺ انبیاء کرام کے بہ شمول تمام مخلوقات اور پوری انسانیت سے افضل ہیں، خود نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا :

أنا سيد ولد آدم يوم القيامة وأول من يشق عنه القبر وأول شافع وأول مشفع ۔ (۵)

ایک اور روایت میں ہے :

أنا سيد الناس يوم القيامة ... ۔ (۶)

(۱) انبیاء:۱۰۷۔ (۲) انعام:۱۹۔
(۳) فرقان:۱۔ (۴) اُصول الدین عند الامام ابی حنیفہ:۴۹۰۔
(۵) صحیح مسلم، باب تفضیل نبیا ﷺ، حدیث نمبر:۲۲۷۸۔ (۶) بخاری عن ابی ہریرہ، حدیث:۳۳۶۱۔

۴- مقام محمود

آپ ﷺ کو قیامت کے دن مقام محمود عطا ہوگا؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا :

عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ۔ (بنی اسرائیل:۷۹)

مقام محمود سے یہ مراد ہے کہ آپ کو قیامت کے دن گناہگاروں کے لئے شفاعت کا حق دیا جائے گا؛(۱) چنانچہ امام ابوحنیفہؒ نے رسول اللہ ﷺ کے حق شفاعت کا بطور عقیدہ ذکر فرمایا ہے :

وشفاعة نبينا عليه الصلاة والسلام للمؤمنين المذنبين ولأهل الكبائر منهم المستوجب العقاب حق ثابت ۔ (۲)

آپ کے اس امتیاز کو ''مقام محمود'' اس لئے کہا جاتا ہے کہ مختلف انبیاء کی اُمتیں اپنے اپنے نبی کے پاس شفاعت کے لئے جائیں گی؛ لیکن اللہ تعالیٰ کی شان جلالی کے سامنے کسی کو زبان کھولنے کی ہمت نہیں ہوگی، یہاں تک کہ سب لوگ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوں گے، آپ ﷺ سفارش فرمائیں گے؛ چنانچہ اس موقع پر سبھوں کی طرف سے آپ کی تعریف وتوصیف کی جائے گی، یہ ایک طویل حدیث ہے جو حدیث شفاعت کے نام معروف ہے۔(۳)

رسول اللہ ﷺ کو دو مرحلوں میں شفاعت کی اجازت دی جائے گی، پہلے مرحلہ میں پوری انسانیت کے لئے، اس کو 'شفاعت کبریٰ' کہتے ہیں، جب پوری انسانیت میدانِ حشر میں جمع ہوگی، لوگ گرمی کی شدت سے پریشان ہوں گے، اور نفسی نفسی کا عالم ہوگا، اس وقت مختلف اُمتیں اپنے اپنے پیغمبروں سے درخواست کریں گی کہ وہ اللہ تعالیٰ سے عرض کریں کہ جلد حساب وکتاب شروع ہو؛ تاکہ لوگوں کو اس مصیبت سے نجات حاصل ہو، ایک نبی دوسرے نبی کا

(۱) دیکھئے تفسیر طبری، آیت مذکورہ۔ (۲) الفقہ الاکبر:۶۱۔

(۳) دیکھئے: بخاری، حدیث نمبر:۲۲۲۲، مسلم، حدیث نمبر:۲۴۲۔

حوالہ دیں گے اور کوئی بھی اللہ تعالیٰ سے عرض کرنے کی جرأت نہیں پائے گا، بالآخر لوگوں کی یہ گزارش آپ ﷺ تک پہنچے گی، اور آپ اللہ تعالیٰ سے درخواست کریں گے، اللہ تعالیٰ اسے قبول فرمائیں گے اور حساب وکتاب کا آغاز ہوجائے گا، یہ شفاعت چوں کہ پوری انسانیت کے لئے ہوگی؛ اس لئے اس کو 'شفاعت کبریٰ' کہتے ہیں، حدیث میں اس کا تفصیل سے ذکر آیا ہے۔(۱)

شفاعت کا دوسرا مرحلہ وہ ہوگا جو آپ ﷺ اہل توحید کے لئے فرمائیں گے، جن کو ان کے گناہوں کی وجہ سے دوزخ یا اَعراف میں رکھا گیا ہوگا، آپ کی سفارش سے بالآخر ایک ایک صاحبِ ایمان جنت میں داخل ہو سکے گا۔(۲)

اس دوسری قسم کی شفاعت کا حق اللہ تعالیٰ دوسرے نیک بندوں جیسے انبیاء کرام، حفاظ، اور شہداء وغیرہ کو بھی دیں گے، حدیث میں اس کی تفصیل موجود ہے؛ لیکن یہ شفاعت بھی اللہ تعالیٰ کی اجازت ہی سے ہوگی، جیسا کہ ارشاد ہے :

مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَہٗٓ اِلَّا بِاِذْنِہٖ ۔ (بقرہ:۲۵۵)



(۱) صحیح البخاری، کتاب احادیث الانبیاء، حدیث نمبر: ۳۳۴۰۔

(۲) صحیح البخاری، حدیث نمبر: ۷۴۱۰۔

بعض مبالغہ آمیز خیالات

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عظمت وفضیلت کا قائل ہونا ایمان کی بنیاد ہے؛ لیکن آپ بہر حال اللہ کے بندے تھے، صفات الوہیت آپ کے اندر نہیں پائی جاتی تھیں؛ چنانچہ :

علمِ غیب

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا کوئی بھی پیغمبر عالم الغیب نہیں تھے، قرآن مجید میں بار بار اس کی صراحت فرمائی گئی ہے :

● قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ وَمَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ۔ (۱)

● وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ وَ يَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ وَ مَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَ لَا حَبَّةٍ فِيْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَ لَا رَطْبٍ وَّ لَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۔ (۲)

● اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ وَ يُنَزِّلُ الْغَيْثَ وَ يَعْلَمُ مَا فِي الْاَرْحَامِ وَ مَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّا ذَا تَكْسِبُ غَدًا وَ مَا تَدْرِيْ نَفْسٌۢ بِاَيِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ۔ (۳)

خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے ایک کم عمر لڑکی نے نظم پڑھی اور اس نے کہا :

''فینا نبی یعلم ما فی غد'' تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے منع فرما دیا۔(۴)

---

(۱) نمل:۶۵۔ (۲) انعام:۵۹۔

(۳) لقمان:۳۴۔ (۴) صحیح البخاری، کتاب المغازی، حدیث نمبر:۴۰۰۱۔

اُم المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ نے فرمایا :

ومن زعم أنه يخبر بما يكون في غد فقد أعظم على الله الفرية ، والله يقول : ''قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ'' ۔ (۱)

محدثین اور فقہاء نے بھی اس کی صراحت کی ہے، ملا علی قاریؒ رقم طراز ہیں :

ذكر الحنفية تصريحاً بالتكفير باعتقاد أن النبي صلى الله عليه وسلم يعلم الغيب لمعارضة قوله تعالىٰ : ''قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ'' ۔ (۲)

حاضر و ناظر

ہر جگہ موجود ہونا اللہ تعالیٰ کی شان ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

- اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا ۔ (نساء:۳۳)
- اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًا بَصِيْرًا ۔ (بنی اسرائیل:۳۰)

اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا کسی بھی نبی یا ولی کو ہر جگہ حاضر و ناظر یقین کرنا جائز نہیں ہے، فقہاء نے اس کو باعث کفر قرار دیا ہے، مشہور فقیہ حسن بن منصور امام فخر الدین قاضی خاںؒ فرماتے ہیں :

رجل تزوج امرأة بغير شهود ، فقال الرجل والمرأة : خدا را وپیغمبر را گواہ کردیم ، قالوا : يكون كفرا ؛ لأنه اعتقد أن الرسول صلى الله عليه وسلم يعلم الغيب ، وهو ما كان يعلم الغيب حين كان في الأحياء فكيف بعد الموت ۔ (۳)

---

(۱) نمل:۶۵، صحیح مسلم:۲۸۷۔ (۲) شرح الفقہ الاکبر لملا علی قاری:۱/ ۲۵۳۔

(۳) قاضی خاں:۴/ ۶۹-۴۶۸ ۴، نیز دیکھئے: البحر الرائق:۲/ ۱۵۵، فتاویٰ ہندیہ:۲/ ۲۸۸۔

مختارِ کُل ہونا

حلال وحرام کرنے کا یا کائنات میں تصرف کا اختیار اللہ تعالیٰ ہی کو ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا کسی اور نبی یا بڑے سے بڑے ولی کو بھی اس کا اختیار نہیں ہے، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک خاص موقع پر شہد نہ کھانے کی قسم کھائی تھی، اللہ تعالیٰ نے اس سلسلہ میں آپ کی تنبیہ فرمائی :

يَاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ تَبْتَغِيْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ ـ (۱)

اسی طرح فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ کا قانون لائق اطاعت ہے :

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ـ (۲)

ایک اور موقع پر فرمایا گیا :

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَ الْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ لٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ ـ (۳)

اللہ کے ساتھ کسی کی عبادت کرنا ہی شرک نہیں ہے؛ بلکہ کسی اور کے بارے میں یہ سمجھنا کہ اس کو حلال وحرام کرنے کا حق ہے، بھی شرک کی ہی ایک صورت ہے؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

وَّ لَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا ـ (۴)

خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا :

و إني لست أحرم حلالاً ولا أحل حراماً ـ (۵)

---

(۱) تحریم:۱۔

(۲) یوسف:۴۰۔

(۳) آل عمران:۷۹۔

(۴) کہف:۲۶۔

(۵) صحیح البخاری، کتاب فرض الخمس، حدیث نمبر:۳۱۱۰۔

اور مسند احمد کی روایت میں ہے :

إنه ليس لی تحريم ما أحل الله ۔ (۱)

اسی طرح کسی کی مغفرت کرنا بھی اللہ تعالیٰ کا حق ہے، کوئی نبی یا اللہ کا نیک بندہ اس کا اختیار نہیں رکھتا کہ وہ کسی کا گناہ معاف کردے؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۔ (۲)

خود پیغمبر اسلام ﷺ سے فرمایا گیا کہ آپ کی بھول چوک کو اللہ نے معاف کردیا ہے :

عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَ تَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ ۔ (۳)

یہاں تک کہ غزوۂ اُحد کے موقع سے آپ ﷺ نے بعض حضرات کے لئے بددُعا کی کہ اے اللہ! فلاں پر لعنت فرما، تو آپ ﷺ سے فرمایا گیا :

لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ ۔ (۴)

بلکہ رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے کہلایا گیا :

قُلْ اِنِّیْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّیْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۔ (۵)

یہاں تک کہ آپ کو جس مقصد کے لئے مبعوث فرمایا گیا تھا، یعنی لوگوں کی ہدایت، اس کا اختیار بھی آپ کے ہاتھوں میں نہیں رکھا گیا :

لَا تَهْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ ۔ (۶)

---

(۱) مسند احمد عن ابی سعید خدری، حدیث نمبر: ۱۱۰۸۴۔

(۲) نساء:۱۱۶۔

(۳) توبہ:۴۳۔

(۴) آل عمران: ۱۲۸، بخاری: کتاب المغازی۔

(۵) زمر:۱۳۔

(۶) القصص:۵۶۔

تمرینی سوالات

(۱) محمد رسول اللہ ﷺ کے نبی برحق ہونے کی کیا دلیل ہے؟

(۲) ختم نبوت کی چند دلیلیں قرآن وحدیث سے پیش کیجئے؟

(۳) مرزا غلام احمد قادریانی، سید علی محمد باب، مرزا علی حسین نووی اوران کے ماننے والوں کا کیا حکم ہے؟

(۴) رسول اللہ ﷺ کو مقامِ محمود عطا فرمایا گیا ہے، اس سے کیا مراد ہے؟

(۵) کیا رسول اللہ ﷺ عالم الغیب تھے، دلائل کی روشنی میں واضح کریں؟

(۶) بعض لوگ آپ ﷺ کو حاضر وناظر تصور کرتے ہیں، کیا یہ درست ہے؟

(۷) رسول اللہ ﷺ مختارِ کل نہیں تھے، اس کی کیا دلیل ہے؟



منصبِ نبوت

نبوت چوں کہ بہت اعلیٰ منصب ہے، ہر نبی بہ مقابلہ دوسرے انسانوں اور دیگر مخلوقات کے افضل ہوتا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو تمام انبیاء سے افضل ہیں؛ اس لئے اللہ کے انبیاء ورسل کے کچھ خاص حقوق ہیں، پہلا حق تو ان پر ایمان لانا ہے، جس کا ذکر اوپر آچکا، دوسرا حق انبیاء کی تعظیم وتوقیر ہے؛ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اس بات سے بھی منع فرمایا کہ پیغمبر کے سامنے اونچی آواز میں بات کی جائے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَ لَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَ اَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ، اِنَّ الَّذِيْنَ يَغُضُّوْنَ اَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ، اِنَّ الَّذِيْنَ يُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ۔ (الحجرات:۲-۴)

علامہ ابوبکر جصاص رازیؒ اس آیت کے ذیل میں فرماتے ہیں :

فيه أمر بتعظيم النبي صلى الله عليه وسلم وتوقيره ۔ (۱)

یہاں تک کہ صحابہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانے کے لئے عرض کیا کرتے تھے: ''راعنا'' اس میں ایک مذموم معنی بھی نکلتا تھا، یا یہود لہجہ کو بدل کر وہ مذموم معنی پیدا کردیتے تھے، قرآن مجید نے اس سے بھی منع فرمادیا اور ارشاد ہوا :

---

(۱) احکام القرآن للجصاص مع تحقیق القمحاوی: ۲۷۸/۵۔

لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَ قُوْلُوا انْظُرْنَا۔ (بقرہ:۱۰۴)

اس لئے اگر کوئی شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا کسی بھی پیغمبر کی اہانت کرے تو یہ باعث کفر ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

وَ لَئِنْ سَاَلْتَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّمَا كُنَّا نَخُوْضُ وَ نَلْعَبُ قُلْ اَبِاللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ وَرَسُوْلِهٖ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُوْنَ ، لَا تَعْتَذِرُوْا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ اِنْ نَّعْفُ عَنْ طَآئِفَةٍ مِّنْكُمْ نُعَذِّبْ طَآئِفَةًۢ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ۔ (توبہ:۶۵-۶۶)

مفسرین نے ''قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ'' کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا ہے :

قد أظهرتم الكفر بإيذاء الرسول والطعن فيه ۔ (۱)

ایک اور موقع پر ارشاد ہوا :

اِنَّ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَ اَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُّهِيْنًا ۔ (احزاب:۵۷)

اسی بنیاد پر یہ بات متفق علیہ ہے کہ جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں بے ادبی کرے، وہ واجب القتل ہے، امام مالکؒ سے منقول ہے :

من سب رسول الله أو شتمه أو عابه قتل ، مسلماً كان أو كافراً ، ولا يستتاب ۔ (۲)

البتہ اس میں اختلاف ہے کہ اگر کوئی مسلمان اس کا مرتکب ہو تو قتل کرنا بطور حد کے ہے یا بطور کفر کے؟ جن لوگوں کے نزدیک کفر کی وجہ سے ہے، ان کے یہاں اگر وہ تائب ہو جائے تو قتل کی سزا ساقط ہو جائے گی، اور جن کے نزدیک بطور حد شرعی کے ہے، ان کے یہاں اس کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی، احناف کے یہاں اس سلسلہ میں اختلاف ہے؛ لیکن راجح یہی ہے کہ اسے بطور حد قتل کیا جائے گا، علامہ ابن نجیم مصریؒ فرماتے ہیں :

(۱) تفسیر بیضاوی: ۳/ ۱۵۳، نیز دیکھئے: تفسیر ابی السعود: ۴/ ۸۰، روح المعانی: ۱۰/ ۱۳۱۔

(۲) الصارم المسلول علی شاتم الرسول لابن تیمیہ: ۳/ ۵۷۲۔

يقتل عندنا حداً ، فلا تقبل توبته فی إسقاطه القتل ـ (۱)

اور یہ حکم صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کی شان میں گستاخی کا نہیں ہے ؛ بلکہ ہر نبی کے ساتھ گستاخی کا یہی حکم ہے ؛ چنانچہ علامہ علاء الدین حصکفیؒ فرماتے ہیں کہ جو شخص کسی نبی کی شان میں گستاخی کی وجہ سے کافر ہوا ، اسے قتل کیا جائے گا اور اس کی توبہ قبول نہیں ہوگی :

الكافر بسب نبی من الأنبياء فإنه يقتل حداً ولا تقبل توبته ـ (۲)

تاہم قتل کا فیصلہ مسلم ملک کی عدالت کو کرنے کا حق ہے ، وہی اس فیصلہ کو نافذ کرے گی ، عوام کو اپنے طور پر فیصلہ کرنے اور سزا نافذ کرنے کا حق نہیں ہے ۔

حُبِ رسول

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت واتباع اور تعظیم وتوقیر کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے دل میں سب سے بڑھ کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم محبت ہو ، یہ مدار ایمان ہے ؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَ اَزْوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ ـ (۳)

ایک اور موقع پر ارشاد ہوا :

قُلْ اِنْ کَانَ اٰبَآؤُکُمْ وَ اَبْنَآؤُکُمْ وَ اِخْوَانُکُمْ وَاَزْوَاجُکُمْ وَ عَشِیْرَتُکُمْ وَ اَمْوَالُ ِاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَ تِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ کَسَادَهَا وَ مَسٰکِنُ تَرْضَوْنَهَاۤ اَحَبَّ اِلَیْکُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَ جِهَادٍ فِیْ سَبِیْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰی یَاْتِیَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ـ (۴)

(۱) البحر الرائق: ۱۳۶/۵ ۔ (۲) الدر المختار: ۲۳۱/۴-۲۳۲ ۔

(۳) الاحزاب: ۶ ۔ (۴) توبہ: ۲۴ ۔

رسول اللہ ﷺ نے اس حقیقت کو بہت واضح الفاظ میں بیان فرمایا ہے؛ چنانچہ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا :

فو الذی نفسی بیده لا یؤمن أحدکم حتی أکون أحب إلیه من والده وولده ۔ (۱)

حجیت حدیث

نبی کی حیثیت صرف قاصد اور ایلچی کی نہیں ہوتی کہ وہ اللہ کا پیغام سنا دے اور بس؛ بلکہ وہ احکام الٰہی کا شارح اور ترجمان بھی ہوتا ہے؛ اس لئے وہ الفاظ وحی کے علاوہ جو کچھ کہے، وہ بھی حجت ہے؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ۔ (۲)

ایک اور موقع پر ارشاد ہوا :

وَ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِى اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۔ (۳)

یعنی تلاوتِ کتاب کے ساتھ تبیین کتاب بھی رسول کی ذمہ داری ہے اور اس کو بھی قبول کرنا واجب ہے، رسول اللہ ﷺ کے ارشادات کو یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ یہ حکم بطور امیر وقت کے ہے، جیسا کہ منکرین حدیث کہتے ہیں؛ اس لئے آپ ﷺ کے بعد آپ کا ارشاد حجت نہیں ہے؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

مَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۔ (۴)

یہ اور اس طرح کی آیات سے واضح ہے کہ آپ کے احکام پر عمل کرنا اور آپ کی منع کی ہوئی باتوں سے بچنا بحیثیت ''رسول'' واجب ہے، اور ظاہر ہے کہ آپ کی نبوت ورسالت قیامت

---

(۱) صحیح بخاری، باب حب الرسول ﷺ، حدیث نمبر: ۱۴۔ (۲) نحل: ۴۴۔
(۳) نحل: ۶۴۔ (۴) حشر: ۷۔

تک کے لئے ہے؛اس لئے جیسے آپ کی حیات طیبہ میں آپ کا فرمان حجت تھا،اسی طرح آپ کے بعد بھی حجت ہے؛ چنانچہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ میں تمہارے درمیان دو ایسی چیزیں چھوڑ کر جارہا ہوں کہ اگر تم ان کو پکڑے رہوگے تو گمراہ نہ ہوگے:''کتاب اللہ وسنتی''۔(۱)

اور ایک موقع پر آپ نے فتنۂ انکار حدیث کی پیشین گوئی کرتے ہوئے اور حجیت حدیث کو واضح کرتے ہوئے فرمایا :

لا ألفين أحدكم متكئا على أريكته يأتيه الأمر من أمري مما أمرت به أو نهيت عنه فيقول لا ندري ما وجدنا في كتاب الله اتبعناه ۔ (۲)

اگر کوئی شخص حدیث کو حدیث جانتے ہوئے قبول کرنے سے انکار کردے تو وہ دائرہ ایمان سے باہر ہوجائے گا؛ چنانچہ امام اسحاق بن راہویہؒ فرماتے ہیں :

من بلغه عن رسول الله صلى الله عليه وسلم خبر يقر بصحته ثم رده بغير تقية فهو كافر ۔ (۳)

علامہ جلال الدین سیوطیؒ لکھتے ہیں :

إعلموا رحمكم الله ، أن من أنكر كون حديث النبي صلى الله عليه وسلم قولاً كان أو فعلاً بشرطه المعروف في الأصول حجة كفر ، وخرج عن دائرة الإسلام وحشر مع اليهود والنصارى أو من شاء من فرق الكفرة ۔ (۴)

علامہ ابن وزیرؒ فرماتے ہیں :

التكذيب لحديث رسول الله صلى الله عليه وسلم مع العلم أنه حديثه كفر صريح ۔ (۵)

---

(۱) مسند بزار، حدیث نمبر: ۸۹۹۳۔　(۲) سنن ابی داؤد، باب فی لزوم السنۃ، حدیث نمبر: ۴۶۰۵۔

(۳) مفتاح الجنۃ فی الاحتجاج بالسنۃ: ۱۴۔　(۴) مفتاح الجنۃ فی الاحتجاج بالسنۃ: ۱۴۔

(۵) العواصم والقواصم: ۲/ ۲۷۴۔

لیکن یہ حکم اس صورت میں ہے، جب کوئی شخص سرے سے حدیث کو حجت نہ مانتا ہو؛ لیکن جو شخص کسی خاص حدیث کو حجت نہ مانتا ہو تو اس سلسلہ میں تفصیل ہے کہ حدیث متواتر کا انکار تو کفر ہے اور حدیث مشہور کا انکار ضلالت وگمراہی :

الفرق بين الخبر المتواتر والخبر المشهور أن جاحد الخبر المتواتر كافر باتفاق ، وجاحد الخبر المشهور مختلف فيه ، فقال الجرجاني : يكفر ، وهو ما نقله الكمال بن الهمام عن الجصاص ، بينما نقل ابن عبد الشكور وصدر الشريعة عنه أنه لا يكفر ، وقال ابن عبد الشكور : والاتفاق على أن جاحده لا يكفر بل يضل ۔ (۱)

اُصولِ فقہ کی مشہور نصابی کتاب ''اُصول الشاشی'' میں حدیث کی تینوں قسم خبر متواتر، خبر مشہور اور خبر واحد کا حکم اور اس کے پس منظر پر بہتر روشنی ڈالی گئی ہے :

ثم المتواتر يوجب العلم القطعي ويكون رده كفراً ، والمشهور يوجب علم الطمأنينة ويكون رده بدعة ، ولا خلاف بين العلماء في لزوم العمل بهما ، وإنما الكلام في الآحاد ، فنقول خبر الواحد هو ما نقله واحد عن واحد أو واحد عن جماعة أو جماعة عن واحد ، ولا عبرة للعدد إذا لم تبلغ حد المشهور ، وهو يوجب العمل به في الأحكام الشرعية ۔ (۲)

البتہ اگر کوئی شخص حدیث کو حجت مانتا ہو؛ لیکن کسی حدیث کے الفاظ میں ایک سے زیادہ معنی مراد لینے کی گنجائش ہو اور وہ اس میں سے کوئی ایک معنی مراد لے، چاہے وہ ظاہر

(۱) مختصر التحریر شرح الکوکب المنیر: ۲/۳۵۷۔ (۲) اُصول الشاشی: ۲۷۲۔

اور متبادر معنی سے ہٹا ہوا ہو تو یہ انکار حدیث نہیں ہے؛ بلکہ اپنے اپنے اجتہاد کے مطابق حدیث کی تاویل ہے، جیسے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا :

البیعان بالخیار ما لم یتفرقا۔ (۱)

اس میں تفرق اقوال کا معنی بھی ہوسکتا ہے اور تفرق ابدان کا بھی، اب بعض فقہاء نے تفرق اقوال کا معنی مراد لیا ، یعنی: جب تک ایجاب کے بعد قبول نہ ہو جائے ، معاملہ کو ختم کرنے کا اختیار ہے، اور بعض نے تفرق ابدان کا معنی مراد لیا، یعنی: ایجاب وقبول ہونے کے بعد بھی جب تک مجلس نہ بدل جائے ، کسی بھی فریق کو معاملہ کے ختم کر دینے کا اختیار ہے، اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے کسی بات کو امر کے صیغہ سے طلب فرمایا، اب بعض فقہاء نے اس کو وجوب پر محمول کیا اور بعض نے کسی قرینہ کی بنا پر استحباب یا اباحت پر محمول کیا، تو یہ حدیث کا انکار نہیں ہے؛ بلکہ اس کی تاویل ہے۔

صحابہؓ

صحبت کے معنی ساتھ ہونے کے ہیں، اسی سے صحابی ہے، جس کے معنی ساتھی کے ہیں؛ لیکن ''صحابی'' کی اصطلاح رسول اللہ ﷺ کے رفقاء کے ساتھ خاص ہے، جس شخص نے ایمان کی حالت میں آپ ﷺ کو دیکھا ہو یا آپ ﷺ نے اسے دیکھا ہو اور پھر ایمان ہی کی حالت میں اس کی وفات ہوئی ہو، اس کو صحابی کہتے ہیں :

ثم أهل الحديث على أن الصاحب من رأى النبي صلى الله عليه وسلم أو رأه النبي صلى الله عليه وسلم كالمكفوفين مسلماً ثم مات على الإسلام۔ (۲)

صحابہ ہی کے ذریعہ قرآن وحدیث اور دین ہم تک پہنچا ہے، اور خود اللہ تعالیٰ نے ان کی تعریف کی ہے؛ اس لئے ان کو ایک خاص اہمیت وعظمت حاصل ہے :

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ

(۱) صحیح البخاری، باب کم یجوز الخیار، حدیث نمبر: ۲۱۱۹۔ (۲) نبراس: ۳۲۸۔

وَ اَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ۔ (التوبہ:۱۰۰)

صحابہ پوری اُمت سے افضل ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے :

خیر الناس قرنی ، ثم الذین یلونهم ، ثم الذین یلونهم ، ثم یجیء أقوام تسبق شهادة أحدهم یمینه ، ویمینه شهادته ۔ (۱)

اوراس بات پر اتفاق ہے کہ تمام صحابہ عادل ہیں :

الصحابة کلهم عدول مطلقاً لظواهر الکتاب وسنة وإجماع من یعتد به ۔ (۲)

اورعلامہ بدرالدین عینیؒ فرماتے ہیں :

لیس فی الصحابة من یکذب وغیر ثقة ۔ (۳)

صحابہ سب کے سب مخلص مسلمان تھے، نہ کوئی کافر تھا اور نہ کوئی منافق ، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ۔ (انفال:۴)

بلکہ صحابہ کے ایمان کو دوسروں کے مومن ہونے کے لئے معیار قرار دیا گیا ہے :

فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۔ (بقرہ:۱۳۷)

جو مسائل اجتہاد پر مبنی ہیں، ان میں صحابی کی رائے سے اختلاف کیا جاسکتا ہے، جیسا کہ فقہاء نے بہت سے مسائل میں کیا ہے؛ لیکن صحابہ پر طعن اور ان کی شان میں گستاخی کرنا جائز نہیں ہے؛ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا :

ولا تسبوا أصحابی ، فلو أن أحدکم أنفق مثل أحد ذهباً ما بلغ مد أحدهم ولا نصیفه ۔ (۴)

(۱) صحیح بخاری عن عبداللہ بن مسعودؓ، حدیث نمبر: ۲۲۵۲۔ (۲) مرقاۃ: ۵/۵۱۷۔

(۳) عمدۃ القاری: ۲/۱۰۵۔ (۴) صحیح بخاری، عن ابی سعید خدری، حدیث: ۳۶۷۳۔

اس لئے اگر کوئی شخص حضرت ابوبکرؓ کی صحابیت کا قائل نہ ہو، یا حضرت عائشہؓ پر تہمت لگاتا ہو، یا حضرت علیؓ کے اندر الوہیت کا دعویٰ کرتا ہو، جیسا کہ بعض روافض کا مذہب ہے، یا جو حضرت علیؓ اور اہل بیت کو صحابی نہیں مانتا ہو، جیسا کہ ناصبیہ کا مذہب ہے تو وہ اسلام سے باہر ہے؛ چنانچہ علامہ ابن عابدین شامیؒ فرماتے ہیں :

نعم لا شک فی تکفیر من قذف السیدۃ عائشۃ رضی الله عنها أو أنکر صحبة الصدیق أو اعتقد الألوهية فی علی رضی الله عنه أو أن جبرئيل غلط فی الوحی أو نحو ذلک من الکفر الصریح المخالف للقرآن، ولکن لو تاب تقبل توبته ۔ (۱)

صحابہ میں بھی فرق مراتب ہے، سب سے اعلیٰ درجہ خلفاء راشدین اور ان میں بھی حضرت ابوبکر صدیقؓ اور ان کے بعد حضرت عمر فاروقؓ کا ہے، پھر بقیہ عشرہ مبشرہ یعنی حضرت طلحہ، حضرت زبیر، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت سعید بن زید اور حضرت ابوعبیدہ بن جراح — رضی اللہ عنہم — کا درجہ ہے۔ (۲)

پھر ان مہاجرین وانصار کا، جو ہجرت سے پہلے ایمان لائے، ان کو 'سابقون اولون' کہا جاتا ہے :

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ وَ اَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۔ (التوبہ:۱۰۰)

اس کے بعد ان صحابہ کا درجہ ہے جو غزوۂ بدر میں شامل ہوئے؛ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے اصحاب بدر کے بارے میں ارشاد فرمایا :

---

(۱) ردالمحتار: ۴/ ۲۳۳ ۔　　(۲) شرح العقیدۃ الطحاویہ: ۴۶۸ ۔

إنه شهد بدراً وما يدريک ؟ لعل الله عز وجل اطلع على أهل بدر ، فقال : إعملوا ما شئتم ، فقد غفرت لکم ۔ (۱)

ان کے بعد وہ حضرات ہیں جو بیعت رضوان میں شامل ہوئے؛ چنانچہ ارشاد ہے :

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۔ (فتح:۱۸)

آخری درجہ میں وہ لوگ ہیں جو فتح مکہ کے بعد مسلمان ہوئے :

أجمع أهل السنة والجماعة على أن أفضل الصحابة أبو بکر فعمر فعثمان فعلی ، فبقية العشرة المبشرة بالجنة ، فأهل بدر ، فباقی أهل أحد فباقی أهل بيعة الرضوان بالحديبية ... وبالجملة فالسابقون الأولون من المهاجرين والأنصار أفضل من غيرهم لقوله تعالیٰ : ''لا يستوی منکم من أنفق من قبل الفتح وقاتل ، أولئک أعظم درجة من الذين أنفقوا من بعد وقاتلوا وکلا وعد الله الحسنی'' ۔ (۲)

خلافت راشدہ کی مدت تیس سال ہے؛ چنانچہ حضرت سفینہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا :

خلافة النبوة ثلاثون سنة ، ثم يؤتی الله الملک أو ملکه من يشاء ، قال سعيد قال لی سفينة : أمسک عليک أبابکر سنتين وعمر عشراً ، وعثمان اثنتی عشرة ، وعلی کذا ، قال سعيد : قلت : لسفينة إن

(۱) بخاری، حدیث نمبر: ۴۸۹۰۔

(۲) شرح الفقہ الاکبر للسمرقندی: ۶۸۔

هؤلاء يزعمون أن علياً عليه السلام لم يكن بخليفة قال : كذبت أستاه بني الزرقاء يعني بني مروان ۔ (۱)

خلافت راشدہ کی اس تیس سالہ مدت میں پہلے خلیفہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کو صحابہ نے بہ اتفاق رائے منتخب کیا، وہ بڑوں میں سے سب سے پہلے اسلام قبول کرنے والے صحابی ہیں اور ہجرت کے نازک اور پُرخطر موقع پر غار ثور میں آپ کے ساتھ رہے، آپ ﷺ نے ان کے بارے میں ارشاد فرمایا :

لو كنت متخذاً من أمتي خليلاً لا تخذت أبابكر ولكن أخي وصاحبي ۔ (۲)

دوسرے خلیفۂ راشد حضرت عمر فاروقؓ ہیں، جن کے ایمان لانے کے بعد پہلی دفعہ مسلمانوں نے صحن کعبہ میں اعلانیہ نماز ادا کی، (۳) وہ مزاج نبوت کے ایسے رمز شناس تھے کہ آپ ﷺ نے فرمایا :

لو كان بعدي نبي لكان عمر ۔ (۴)

حضرت ابوبکرؓ نے صحابہ کے مشورہ سے انھیں خلافت کے لئے نامزد فرمایا اور پھر تمام مہاجرین وانصار نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی۔

تیسرے خلیفہ حضرت عثمان غنیؓ ہیں، جن کے نکاح میں آپ نے اپنی دو صاحبزادیاں دیں، اور جن کی مالی قربانیوں کا اسلام کے فروغ میں بڑا حصہ ہے، حضرت عمرؓ نے اپنی وفات سے پہلے چھ حضرات کا نام دیا تھا کہ ان میں سے کسی کو خلیفہ منتخب کرلیا جائے، بہرحال اخیر میں حضرت عثمان ذوالنورینؓ کے نام پر اتفاق ہوگیا۔

---

(۱) سنن ابی داؤد، حدیث: ۴۶۴۶۔

(۲) صحیح بخاری، حدیث: ۳۶۵۶۔

(۳) سیرت ابن ہشام: ۱/۳۴۲۔

(۴) المعجم الکبیر للطبرانی، حدیث نمبر: ۸۲۲۔

چوتھے خلیفہ حضرت علی مرتضیٰؓ ہیں، جو حضرت خدیجہؓ کے بعد سب سے پہلے اسلام لانے والوں میں ہیں، رسول اللہ ﷺ کی نظر میں ان کے مقام ومرتبہ کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت علیؓ سے محبت اور بغض کو مسلمان اور منافق کے درمیان معیار قرار دیا :

لا یحب علیاً إلا مؤمن ولا یبغضه إلا منافق ۔ (۱)

ایک موقع پر صحابہ کے جمع غفیر کے درمیان آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا :

من کنت مولاہ فھذا علی مولاہ ۔ (۲)

حضرت عثمان غنیؓ کی شہادت کے بعد مہاجرین وانصار نے حضرت علیؓ سے اصرار کیا کہ وہ ان کے ہاتھ پر بیعت کریں گے، آپ اس کے لئے تیار نہیں تھے؛ لیکن ان کے اصرار پر آمادہ ہوئے اور مسجد نبوی میں مہاجرین وانصار نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی اور اس طرح بہ اتفاق رائے آپ چوتھے خلیفہ منتخب ہوئے۔

حضرت علیؓ کی شہادت پر تقریباً ساڑھے انتیس سال مکمل ہوتے ہیں، اس کے بعد مہاجرین وانصار نے بہ اصرار حضرت حسن بن علیؓ کے ہاتھ پر بیعت کی، یہ حضور ﷺ کے دو محبوب نواسوں میں سے ایک تھے، اور آپ نے ان کے بارے میں پیشین گوئی کی تھی کہ وہ اُمت کے دو گروہوں کے درمیان صلح کا ذریعہ بنیں گے :

ابنی ھذا سید ولعل اللہ أن یصلح بین فئتین من المسلمین ۔ (۳)

چنانچہ انھوں نے چند ہی ماہ بعد اُمت کو اختلاف سے بچانے کے لئے حضرت معاویہؓ کے حق میں دستبردار ہوکر صلح کر لی، حضرت حسنؓ کی دستبرداری پر تیس سال پورے ہوتے ہیں؛ اس لئے ان کا دور بھی خلافت راشدہ میں شامل ہے؛ چنانچہ حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں :

---

(۱) المعجم الکبیر للطبرانی، حدیث نمبر: ۸۸۶۔　(۲) مسند احمد، حدیث نمبر: ۱۹۳۰۲۔

(۳) بخاری، باب مناقب الحسن والحسین، حدیث نمبر: ۳۷۴۶۔

الخلافة بعدی ثلاثون سنة ثم تکون ملکاً ؛ لأن الثلاثین سنة لم یکن فیھا إلا الخلفاء الأربعة وأیام الحسن بن علی ۔(۱)

اور علامہ عینیؒ کہتے ہیں :

وتکملة الثلاثین بخلافة الحسن بن علی رضی اللہ عنھما نحوا من ستة أشھر ۔(۲)

لیکن چوں کہ ان کی خلافت کی مدت کم رہی اور وہ خلافت سے دستبردار ہو گئے تھے، اس لئے مستقل طور پر خلفاء راشدین میں ان کا نام نہیں ذکر کیا جاتا ہے۔

اہل بیتؓ

صحابہ میں ایک اہم مقام رسول اللہ ﷺ سے خصوصی نسبت کی وجہ سے اہل بیت کا ہے، اہل بیت سے تین گروہ مراد ہیں :

(۱) حضرت علیؓ، حضرت فاطمہؓ اور حضرت حسنؓ و حسینؓ؛ چنانچہ اُم المومنین حضرت عائشہؓ سے مروی ہے :

خرج النبی صلی اللہ علیه وسلم غداة وعلیه مرط مرجل ، من شعر أسود ، فجاء الحسن بن علی فأدخله ، ثم جاء الحسین فدخل معه ، ثم جاءت فاطمة فأدخلها ، ثم جاء علی فأدخله ثم قال : ’’اِنَّمَا یُرِیۡدُ اللّٰهُ لِیُذۡهِبَ عَنۡكُمُ الرِّجۡسَ اَهۡلَ الۡبَیۡتِ وَیُطَهِّرَكُمۡ تَطۡهِیۡرًا‘‘ ۔ (۳)

---

(۱) فتح الباری: ۱۳/ ۲۱۲۔

(۲) عمدۃ القاری: ۶/ ۱۷۴۔

(۳) احزاب: ۳۳، صحیح مسلم، حدیث: ۲۴۲۴۔

یہ حدیث اُم المومنین حضرت اُم سلمہؓ سے بھی منقول ہے، جس میں آپ ﷺ نے ان پانچوں حضرات کو جمع کر کے فرمایا: ''اللّٰھم ھؤلاء أھل بیتی و خاصتی'' حضرت اُم سلمہؓ کی روایت دو وجہ سے بڑی اہمیت کی حامل ہے، ایک یہ کہ جب اُم المومنین حضرت اُم سلمہؓ نے ان پانچوں کے ساتھ شامل ہونا چاہا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم بھی خیر پر ہو؛ لیکن اِس موقع پر آپ ﷺ نے ان کو شریک کرنا ضروری نہیں سمجھا؛ چنانچہ روایت کے الفاظ اس طرح ہیں :

عن ام سلمة : أن النبی صلی اللہ علیه وسلم جلّلَ علی الحسن والحسین وعلی وفاطمة کساء ، ثم قال : اللھم ھؤلاء أھل بیتی وخاصتی ، أذھب عنھم الرجس وطھرھم تطھیراً ، فقالت ام سلمة : وأنا معھم یا رسول اللہ ، قال : إنک إلی خیر ۔ (۱)

دوسرے: یہ آیت: ''اِنَّمَا یُرِیْدُ اللہُ لِیُذْھِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَھْلَ الْبَیْتِ وَ یُطَھِّرَکُمْ تَطْھِیْرًا'' (احزاب: ۳۳) جس وقت نازل ہوئی، اس وقت آپ ﷺ کا قیام حضرت اُم سلمہؓ ہی کے مکان میں تھا، جیسا کہ طبرانی کی روایت میں ہے :

فی بیتی نزلت إنما یرید اللہ إلی آخرہ ۔ (۲)

نیز حضرت ابوسعید خدریؓ سے منقول ہے :

نزلت یعنی ھذہ الآیة فی خمسة : النبی صلی اللہ علیه وسلم وعلی وفاطمة والحسن والحسین ۔ (۳)

اور حضرت انسؓ سے مروی ہے :

إن رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم کان یمر بباب

---

(۱) ھذا حدیث حسن صحیح، رواہ الترمذی، عن اُم سلمہؓ، حدیث نمبر: ۳۸۷۱۔

(۲) المعجم الکبیر للطبرانی، حدیث نمبر ۶۲۷۔

(۳) مجمع الزوائد، کتاب المناقب، باب فی فضل اہل البیت، حدیث نمبر: ۱۴۹۷۶۔

فاطمة ستة أشهر إذا خرج إلى صلاة الفجر ، يقول : الصلاة يا أهل البيت ۔ (۱)

خود حضرت حسن بن علیؓ نے بھی خطبہ دیتے ہوئے فرمایا :

ایها الناس ! من عرفنی فقد عرفنی ، ومن لم یعرفنی فأنا الحسن بن علی وأنا ابن الوصی وأنا ابن البشیر وأنا ابن النذیر وأنا ابن الداعی إلی الله بإذنه وأنا ابن السراج المنیر وأنا من أهل البیت الذی کان جبرئیل إلینا ، ویصعد من عندنا ، وأنا من أهل البیت الذین أذهب الله عنهم الرجس وطهرهم تطهیراً ، وأنا من أهل البیت الذی افترض الله مودتهم علی کل مسلم ۔ (۲)

اسی طرح جب آپ ﷺ نے وفد بنونجران کو مباہلہ کی دعوت دی ، اور یہ آیت نازل ہوئی :

اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللہِ کَمَثَلِ اٰدَمَ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ کُنْ فَیَکُوْنُ ، اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَکُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِیْنَ ۔ (آل عمران:۵۹-۶۰)

رسول اللہ ﷺ نے ان ہی چاروں حضرات کو جمع فرمایا :

دعا رسول الله صلی الله علیه وسلم علیا و فاطمة وحسن وحسیناً فقال : اللّٰهم هؤلاء أهلی ۔ (۳)

پس اس روایت میں بھی آپ ﷺ نے ان حضرات کو اپنا اہل بیت قرار دیا ، آپ کی

(۱) مسند احمد ، حدیث نمبر: ۱۴۰۴۰ ، ترمذی ، حدیث نمبر: ۳۲۰۶ ۔

(۲) مستدرک حاکم ، حدیث نمبر: ۴۸۰۲ ۔

(۳) مسلم ، عن سعد بن ابی وقاصؓ ، حدیث نمبر: ۲۴۰۴ ، مسند احمد ، حدیث نمبر: ۱۶۰۸ ۔

دوسری صاحبزادیوں — حضرت زینبؓ، حضرت رقیہؓ اور حضرت اُم کلثومؓ — کی اس سے پہلے ہی وفات ہوچکی تھی اور حضرت ابراہیمؓ اگرچہ زندہ تھے؛ لیکن بہت چھوٹے تھے؛ اس لئے آپ ﷺ نے اس موقع پر ان کو نہیں بلایا۔(۱)

آپ ﷺ کو حضرت علیؓ حضرت فاطمہؓ اور حضرات حسنینؓ سے کس درجہ محبت تھی، اس کا اندازہ اس روایت سے کیا جاسکتا ہے :

إن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال لعلي وفاطمة والحسن والحسين : أنا حرب لمن حاربتهم وسِلم لمن سالمتهم ۔ (۲)

رسول اللہ ﷺ کا خاندان حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ ہی کے ذریعہ آگے بڑھا :

ولم يكن لرسول الله صلى الله عليه وسلم عقب إلا من ابنته فاطمة فانتشر نسله الشريف منها فقط ، من جهة السبطين أعني الحسنين ۔ (۳)

حضرت فاطمہؓ کو آپ ﷺ نے خواتین جنت کا سردار قرار دیا ہے :

فاطمة سيدة نساء أهل الجنة ۔ (۴)

نیز ارشاد فرمایا :

فاطمة بضعة مني من آذاها فقد آذاني ۔ (۵)

(۲) اہل بیت میں دوسرا گروہ تمام بنو ہاشم کا ہے؛ چنانچہ حضرت زید بن ارقمؓ کی ایک روایت میں اہل بیت کے منصب و مقام کا بھی ذکر فرمایا گیا ہے اور پھر خود حضرت زیدؓ نے واضح فرمایا ہے کہ اہل بیت سے کون حضرات مراد ہیں؛ چنانچہ روایت ہے :

---

(۱) منہاج السنۃ لابن تیمیہ: ۱۲۹/۷۔ (۲) سنن ترمذی من زید بن ارقم، حدیث نمبر: ۳۸۷۰۔

(۳) شرح فقہ اکبر لملا علی قاری: ۲۲۵۔ (۴) سنن ترمذی، حدیث نمبر: ۳۷۸۱۔

(۵) السنن الکبریٰ للبیہقی، حدیث نمبر: ۲۰۸۶۲۔

أما بعد ، ألا أيها الناس ؛ فإنما أنا بشر يوشك أن
يأتي رسول ربي فأجيب ، وأنا تارک فيكم ثقلين ،
أولهما كتاب الله فيه الهدى والنور فخذوا بكتاب
الله ، واستمسكوا به فحث على كتاب الله ورغّب فيه ،
ثم قال : وأهل بيتي ، أذكركم الله في أهل بيتي ،
أذكركم الله في أهل بيتي ، أذكركم الله في أهل بيتي ،
فقال له حصين : ومن أهل بيته يا زيد ؟ أليس نساءه
من أهل بيته ؟ قال : نساءه من أهل بيته ولكن أهل
بيته من حرم الصدقة بعده ، قال : من هم ؟ قال :
هم آل علي وآل عقيل وآل جعفر وآل عباس ، قال :
كل هؤلاء ، حرم الصدقة ؟ قال : نعم ۔ (۱)

اس سے معلوم ہوا کہ نسبی اعتبار سے تمام بنو ہاشم اہل بیت میں شامل ہیں، نیز آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''بنو ہاشم اور بنو مطلب ایک ہی چیز ہیں'' (۲) اسی لئے حارثہ بن عبد المطلب بھی اس میں شامل ہیں؛ اسی لئے ان سب کے لئے زکوٰۃ حرام کی گئی ہے، جیسا کہ مذکور ہوا، ان ہی میں عم رسول حضرت عباسؓ بھی ہیں، جن کے بارے میں آپ ﷺ نے فرمایا :

العباس مني وأنا منه ۔ (۳)

(۳) اہل بیت کا تیسرا گروہ ازواج مطہراتؓ کا ہے، جن کا آپ کے اہل میں ہونا ظاہر ہے؛ کیوں کہ از روئے لغت بیوی پر اہل کا اطلاق ہوتا ہے؛ (۴) قرآن مجید میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیوی حضرت سارہ علیہا السلام کے لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے 'اہل بیت' کی تعبیر اختیار کی گئی ہے :

(۱) صحیح مسلم، حدیث: ۲۴۰۸۔ (۲) بخاری، عن جبیر بن مطعم وعن عثمان بن عفان، حدیث نمبر: ۳۱۴۰، نسائی، عن جبیر بن مطعم وعن عثمان بن عفان، حدیث نمبر: ۴۱۳۷۔
(۳) المغرب فی ترتیب المعرب: ۳۱/۱۔ (۴) ترمذی، حدیث نمبر: ۳۷۵۹۔

قَالُوْۤا اَتَعْجَبِیْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَ بَرَكٰتُهٗ عَلَیْكُمْ اَهْلَ الْبَیْتِ ۔ (۱)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بیوی کا ذکر ان کے اہل سے فرمایا گیا ہے :

اِذْ رَاٰ نَارًا فَقَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْۤا اِنِّیْۤ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّیْۤ اٰتِیْكُمْ مِّنْهَا بِقَبَسٍ اَوْ اَجِدُ عَلَى النَّارِ هُدًى ۔ (۲)

حضرت ایوب علیہ السلام کی بیوی کے لئے بھی ’’اہل‘‘ کا لفظ آیا ہے :

فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَكَشَفْنَا مَا بِهٖ مِنْ ضُرٍّ وَّ اٰتَیْنٰهُ اَهْلَهٗ وَمِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَ ذِكْرٰى لِلْعٰبِدِیْنَ ۔ (۳)

خود سورۂ احزاب کی آیت نمبر: ۳۲-۳۳ کا بھی آغاز ازواجِ مطہرات کو خطاب کرتے ہوئے ہوا ہے، اس سے صاف طور پر معلوم ہوا کہ ازواج مطہرات بھی اہل بیت میں شامل ہیں؛ البتہ اس موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا صرف حضرت علیؓ، حضرت فاطمہؓ، حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کو بلانا اور ان کو اپنی چادر میں داخل کرنا اس لئے تھا کہ وہ آپ کے گھر (بیت) میں نہیں رہتے تھے، الگ مکان میں رہتے تھے اور ازواجِ مطہرات کا قیام تو تھا ہی آپ کے گھر میں اوران کا آپ کے اہل بیت میں ہونا ظاہر تھا؛ اس لئے آپ نے خاص طور پر ان چاروں حضرات کو بلایا؛ تاکہ ان کا بھی اہل بیت میں سے ہونا واضح ہوجائے؛ البتہ ازواج مطہراتؓ ان لوگوں میں شامل نہیں تھیں، جن کے لئے زکوٰۃ حرام قرار دی گئی ہے۔(۴)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ازواج مطہرات گیارہ ہیں، ان کے علاوہ آپ کے حرم میں تین باندیاں بھی تھیں، ازواج کے نام اس طرح ہیں :

---

(۱) ہود: ۷۳۔

(۲) طٰہٰ: ۱۰۔

(۳) الانبیاء: ۸۴۔

(۴) فیض الباری: ۳/ ۱۵۷۔

(۱) حضرت خدیجہ بنت خویلدؓ۔

(۲) حضرت سودہ بنت زمعہؓ۔

(۳) حضرت عائشہ صدیقہ بنت ابوبکر صدیقؓ۔

(۴) حضرت حفصہ بنت عمر فاروقؓ۔

(۵) حضرت زینب بنت خزیمہؓ۔

(۶) حضرت اُم سلمہؓ بنت اُمیہ۔

(۷) حضرت زینب بنت جحشؓ۔

(۸) حضرت جویریہؓ بنت حارث۔

(۹) حضرت اُم حبیبہؓ بنت ابی سفیانؓ۔

(۱۰) حضرت صفیہؓ بنت حیی۔

(۱۱) حضرت میمونہؓ بنت حارثہ۔

باندیوں کے نام اس طرح ہیں :

(۱) حضرت ماریہ قبطیہؓ۔

(۲) حضرت ریحانہؓ بنت شمعون۔

(۳) حضرت نفیسہؓ۔(۱)

ازواج مطہرات سب کی سب اُمت کی مائیں ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاَزْوَاجُهٗٓ اُمَّهٰتُهُمْ ۔ (۲)

ان سبھی کا بہت بلند مقام ہے اور اسلام کی دعوت واشاعت میں ان کی نصرت کا بڑا حصہ ہے؛ البتہ ان میں بھی حضرت خدیجہ الکبریٰؓ اور حضرت عائشہ صدیقہؓ کا خصوصی درجہ ہے، نبوت ملنے کے بعد سب سے پہلے آپ پر حضرت خدیجہؓ ایمان لائیں، مکہ کی پُر ابتلاء زندگی میں

---

(۱) سیر اعلام النبلاء:۱/ ۲۲۵-۲۲۸۔

(۲) احزاب:۶۔

ان کی غم گساری اور قربانی نے آپ کو ظاہری سہارا فراہم کیا، آپ کی تمام اولاد سوائے حضرت ابراہیمؓ کے ان ہی کے بطن مبارک سے ہوئیں اور آپ ﷺ نے ان کے بارے میں فرمایا :

خير نسائها خديجة بنت خويلد ۔ (۱)

حضرت عائشہ صدیقہؓ آپ کو بہت محبوب تھیں، وفات کے وقت آپ کا سر مبارک ان کے سینہ پر تھا، (۲) ان کے ذریعہ ۲۲۱۰ احادیث منقول ہیں، وہ تفسیر وحدیث اور فقہ وفتاویٰ میں اعلیٰ مقام رکھتی تھیں اور اکابر صحابہ ان سے رُجوع کیا کرتے تھے، آپ ﷺ نے حضرت عائشہؓ کے بارے میں فرمایا :

فضل عائشة على النساء كفضل الثريد على سائر الطعام ۔ (۳)

دو غالی گروہ

اہل بیت میں سے سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کی نسبت سے دو غالی گروہ پیدا ہو گئے :

ایک : روافض، جو حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کی خلافت کا انکار کرتے ہیں، صحابہ کی شان میں لعن طعن کرتے ہیں اور حضرت علیؓ کی محبت میں غلو کرتے ہیں، یہ گروہ اپنے مختلف فرقوں کے ساتھ ابھی بھی موجود ہے۔

دوسرا گروہ ناصبیہ اور خوارج کا ہے، ناصبیہ حضرت علیؓ کی خلافت کو نہیں مانتے، اور ان پر سب وشتم کرتے ہیں، اب بحیثیت ایک فرقہ کے شاید یہ موجود نہیں ہیں؛ لیکن اہل بیت سے بغض پر مبنی افکار کے حامل بعض افراد اور مصنفین اِس دور میں بھی موجود ہیں، جنھوں نے حضرت علیؓ اور حضرات حسنینؓ کے مقام کو گرانے کی کوشش کی ہے، ناصبیہ ہی سے قریب ایک فرقہ خوارج کا ہے، جو جنگ صفین میں سیدنا حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کی طرف سے نزاع ختم کرنے کے لئے تحکیم

(۱) صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۲۴۳۰۔

(۲) صحیح البخاری، حدیث نمبر: ۴۴۵۱۔

(۳) بخاری، حدیث نمبر: ۵۴۱۹۔

میں شریک تمام صحابہ کو کافر کہتے ہیں، اس کے مختلف فرقے افریقی ممالک میں پائے جاتے ہیں، ان میں نسبتاً ایک معتدل فرقہ 'ابازیہ' ہے، جو خلیجی ریاست 'عمان' میں برسر اقتدار ہے۔

اہل سنت والجماعت ان سب سے بری ہیں، وہ خلفاء راشدین کی خلافت کو تسلیم کرتے ہیں اور تمام صحابہ اور اہل بیت سے محبت و تعلق رکھتے ہیں۔

تمام صحابہ کا احترام اور ان کی شان میں بدگوئی سے بچنا واجب ہے، صحابہ کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

أُولَٰٓئِكَ الَّذِينَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوبَهُمْ لِلتَّقْوٰى ۚ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِيمٌ۔ (حجرات:۳)

اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

من أحبهم فبحبى أحبهم ومن أبغضهم فببغضى أبغضهم۔ (۱)

اس میں شبہ نہیں کہ حضرت علیؓ کے عہد میں غلط فہمی کی بنیاد پر صحابہ کے درمیان دو جنگیں ہوئیں، جنگ جمل اور جنگ صفین، ان جنگوں میں اہل سنت کے نزدیک حضرت علیؓ حق پر تھے؛ چنانچہ شیخ عبدالقادر بغدادیؒ کہتے ہیں:

قالوا أى أهل السنة والجماعة بإمامة على فى وقته، وقالوا بتصويب على فى حروبه بالبصرة وبصفين ونهروان۔ (۲)

یہ جنگیں کچھ مفسدین کی سازش اور مکر وفریب کی وجہ سے ہوئیں، ورنہ ان میں باہم رنجش نہیں تھی اور نہ یہ آپس میں لڑنا چاہتے تھے، یہ ایک دوسرے کے قدرداں تھے، اسی لئے ہر فریق سے دوسرے کے فضائل منقول ہیں، (۳) بہرحال یہ جنگ صرف غلط فہمی کی بنا پر ہوئی:

قالوا أى أهل السنة والجماعة: بأن طلحة والزبير

---

(۱) سنن ترمذی، حدیث نمبر: ۳۸۶۲۔ (۲) کذا فی کتاب الفرق بین الفرق: ۳۵۰۔

(۳) دیکھئے: سیرت خلفاء راشدین: ۱۲، از: حضرت مولانا عبدالشکور فاروقیؒ۔

تابا ورجعا عن قتال علی لکن الزبیر قتله عمرو بن جزموز بوادی السباع بعد منصرفه من الحرب و إن عائشة قصدت الإصلاح بین الفریقین فغلبها بنوصبة والأزد علی رأیها وقاتلوا علیا دون إذنها حتی کان من الأمر ما کان ۔ (۱)

اسی طرح حضرت حسینؓ نے جو یزید کی بیعت سے انکار کیا، یہاں تک کہ آپ اپنے پورے خاندان کے ساتھ میدان کربلا میں شہید کردیئے گئے، اس میں حضرت حسینؓ اوران کے رفقاء حق پر تھے؛(۲) کیوں کہ حضرت حسینؓ چاہتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے خلافت کی جوسنت قائم فرمائی ہے، وہ باقی رہے، اور قیصر وکسری کے نظام ملوکیت کی جو مذمت فرمائی، وہ اُمتِ محمدیہ میں مروج نہ ہوجائے؛ چنانچہ علامہ ابن عماد حنبلیؒ یزید کے خلاف حضرت حسینؓ کے خروج کے بارے میں فرماتے ہیں :

والعلماء مجمعون علی تصویب قتال علی لمخالفیه لأنه إمام الحق ونقل الاتفاق أیضاً تحسین خروج الحسین رضی الله عنه علی یزید وخروج ابن الزبیر وأهل الحرمین علی بنی أمیة ۔ (۳)

یہاں تک کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے سامنے ایک شخص نے یزید کے ساتھ ''امیر المؤمنین'' کہا تو آپ نے اس کو ۲۰/کوڑے لگائے :

عن نوفل بن ابی الفرات قال : کنت عند عمر بن عبد العزیز ، فقال رجل : قال أمیر المومنین یزید ، فأمر به فضرب عشرین سوطاً ۔ (۴)

---

(۱) کتاب الفرق بین الفرق:۳۵۰۔ (۲) سیر اعلام النبلاء:۳۷۰/۴۔

(۳) شذرات الذہب:۲۷۶/۱۔ (۴) سیر اعلام النبلاء:۴۱/۴۔

مشاجرات صحابہؓ

صحابہ کے اختلاف اور نزاع پر گفتگو کی جائے تو متعارض تاریخی روایات کے سبب اور ان برگزیدہ نفوس کو موجودہ دور کے لوگوں پر قیاس کرنے کی وجہ سے بدگمانی پیدا ہو جاتی ہے اور یہ بدگمانی بعض اوقات گستاخی تک پہنچا دیتی ہے ؛ اس لئے اہل سنت والجماعت کے نزدیک مشاجرات صحابہ پر گفتگو کرنا جائز نہیں ہے، مگر ضرورتِ شرعی کی بنا پر اور نیک نیتی کے ساتھ گفتگو کی جائے تو گنجائش ہے،(۱) ورنہ اس سلسلہ میں سکوت اختیار کرنا چاہئے :

المبحث الرابع والأربعون فی بیان وجوب الکف عما شجر بین الصحابة ووجوب اعتقاد أنهم ماجورون ... وذلک لأنهم کلهم عدول باتفاق أهل السنة سواء من لابس الفتن ومن لم یلابسها کفتنة عثمان ومعاویة ووقعة الجمل ، وکل ذلک وجوباً لإحسان الظن بهم وحملاً لهم فی ذلک علی الاجتهاد ... وکل مجتهد لمصیب أو المصیب واحد والمخطئ معذور بل مأجور ـ (۲)

تمرینی سوالات

(۱) رسول اللہ ﷺ کی شان میں گستاخی کرنے والے کا کیا حکم ہے؟

(۲) حجیت حدیث پر چند آیات واحادیث پیش کیجئے ؟

(۳) منکر حدیث کا کیا حکم ہے، کس حدیث کا منکر کافر ہوگا اور کس کا منکر کافر نہیں ہوگا ؟

(۴) صحابی کی تعریف کیجئے ؟

---

(۱) سیرت خلفاء راشدین : ۱۱، از : حضرت مولانا عبد الشکور فاروقیؒ ـ

(۲) الیواقیت والجواہر : ۲/ ۷۷ ـ

(۵) صحابہ کے عادل ہونے کا کیا مطلب ہے؟

(۶) فرقِ مراتب کے اعتبار سے صحابہ کے درجات پر روشنی ڈالئے؟

(۷) خلافتِ راشدہ کی مدت کیا ہے؟

(۸) دین میں اہل بیت کا کیا مقام ہے؟

(۹) ازواجِ مطہرات اہل بیت میں شامل ہیں یا نہیں؟

(۱۰) حضرت علیؓ کی نسبت سے دو غالی گروہ پیدا ہوئے، ایک: روافض، دوسرے: ناصبیہ اور خوارج، ان کے عقائد کیا تھے؟

(۱۱) سیدنا حضرت علیؓ اور حضرتِ معاویہؓ نیز بعد میں حضرت حسینؓ اور یزید کے درمیان جو جنگیں ہوئی، ان کے بارے میں اہل سنت والجماعت کا کیا نقطۂ نظر ہے؟

(۱۲) مشاجراتِ صحابہ کے بارے میں کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیے؟



آسمانی کتابوں پر ایمان

اللہ تعالیٰ نے جس طرح انسان کی جسمانی غذا کا انتظام کیا ہے اور اس کی ضرورتوں کے لئے اتنی بڑی دنیا پیدا فرمائی ہے، اسی طرح اس کی روح کے لئے بھی غذا کا انتظام فرمایا ہے، اور وہ ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کی جانے والی وحی، جس کے ذریعہ انسان کو دنیوی اور اُخروی زندگی میں کامیابی کا راستہ بتایا جاتا ہے، یہ وحی کسی پیغمبر پر لکھی ہوئی تختیوں کی شکل میں نازل کی گئی؛ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں ارشاد ہے :

وَكَتَبْنَا لَهُ فِي الْاَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْعِظَةً وَّ تَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ ۔(۱)

اور کبھی فرشتہ کے ذریعہ پیغمبر تک اللہ تعالیٰ کی ہدایت اور اوامر ونواہی پہنچتے تھے، انبیاء اس کو اپنے الفاظ میں بیان فرمایا کرتے تھے، اور ان کو لکھ لیا جاتا تھا، گزشتہ آسمانی کتابیں تورات وانجیل وغیرہ زیادہ تر اسی طرح انسانیت تک پہنچیں، اور کبھی نبی پر کلام کا صرف مفہوم نہیں؛ بلکہ اس کے الفاظ بھی اُتارے گئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر قرآن مجید اسی طرح نازل کیا گیا؛ اس لئے قرآن مجید کے الفاظ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں۔

مسلمان ہونے کے لئے یہ شرط ہے کہ تمام آسمانی کتابوں پر ایمان ہو؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۔ (۲)

---

(۱) اعراف:۱۴۵۔

(۲) بقرہ:۴۔

ایک اور موقع پر قرآن مجید اور گزشتہ الہامی کتابوں پر ایمان لانے کا حکم ان الفاظ میں دیا گیا :

قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَ مَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطِ وَ مَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَ عِيْسٰى وَ مَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۔ (۱)

لہٰذا قرآن میں جن پہلی آسمانی کتابوں کا نام لیا گیا ہے، ان پر بالتعیین، اور جن کا نام نہیں لیا گیا ہے، ان پر اجمالاً ایمان لانا ضروری ہے، قرآن مجید میں بحیثیت مجموعی چار کتابوں کے نام لئے گئے ہیں اور ان کے علاوہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہونے والے صحائف کا ذکر آیا ہے :

اِنَّ هٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ، صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَ مُوْسٰى ۔ (۲)

کتابوں میں ایک تورات ہے، جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل کی گئی؛ چنانچہ ارشاد ہے :

قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ الَّذِيْ جَآءَ بِهٖ مُوْسٰى نُوْرًا وَّهُدًى لِّلنَّاسِ ۔ (۳)

اور بعض دوسری آیات میں صریحاً تورات کا نام آیا ہے :

اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّ نُوْرٌ ۔ (۴)

حضرت داؤد علیہ السلام کو زبور عطا فرمائی گئی :

وَ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ۔ (۵)

---

(۱) بقرہ: ۱۳٦۔ (۲) اعلیٰ: ۱۹۔
(۳) انعام: ۹۱۔ (۴) مائدہ: ۴۴۔
(۵) نساء: ۱٦۳۔

اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو انجیل عطا کی گئی :

وَ قَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَ اٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ فِيْهِ هُدًى وَّنُوْرٌ وَّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَ هُدًى وَّمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ۔ (مائدہ:۴۶)

خاتم النبیین سید الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر قرآن مجید نازل کیا گیا۔

چوں کہ گزشتہ کتابیں لفظی اور معنوی تحریف سے محفوظ نہیں رہ سکیں؛ اس لئے ان پر صرف اس قدر ایمان رکھنا ضروری ہے کہ ان انبیاء کرام پر اللہ کی طرف سے یہ کتابیں نازل کی گئی تھیں اور ان میں مذکور تمام باتیں حق تھیں؛ لیکن چوں کہ اب ان کتابوں میں بہت ساری تحریف ہو چکی ہے؛ اس لئے ان کی موجودہ صورت کی حقانیت پر ایمان لانے کا حکم نہیں ہے؛ البتہ قرآن مجید پر یہ ایمان رکھنا ضروری ہے کہ اس کا ایک ایک حرف من جانب اللہ ہے۔

قرآن مجید کی جو تعریفات کی گئی ہیں، ان سب کو سامنے رکھا جائے تو اس کی جامع تعریف اس طرح ہوگی :

قرآن مجید اللہ کا وہ کلام ہے جس کے الفاظ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل کئے گئے ہیں، جو عربی زبان میں ہے اور تواتر کے ساتھ منقول ہے، اس کی ابتداء سورہ فاتحہ سے ہوتی ہے اور انتہاء سورہ ناس پر۔(۱)

جیسے آسمانی کتابوں پر ایمان لانا ضروری ہے، اسی طرح ان کی توہین یا ان کا انکار کفر ہے :

... وکذلک إن جحد التوراۃ والإنجیل وکتب اللہ المنزلۃ أو کفر بھا ، أو لعنھا ، أو سبھا ، أو استخف بھا فھو کافر ۔ (۲)

(۱) الواضح فی علوم القرآن للبغاء:۱۵۔ (۲) الشفاء بتعریف حقوق المصطفیٰ:۲/۲۴۶۔

قرآن مجید کی بعض خصوصیات

دوسری آسمانی کتابوں کے مقابلہ میں قرآن مجید کو بعض خصوصیات حاصل ہیں :

۱- دوسری آسمانی کتابیں تحریف سے محفوظ نہیں رہ سکیں؛ لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے قرآن مجید کی حفاظت فرمائی گئی ہے؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحٰفِظُوْنَ ۔ (حجر:۹)

ایک اور موقع پر فرمایا گیا :

لَّا يَأْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ ۔ (فصلت:۴۲)

اس لئے قرآن مجید پر ایمان لانے میں یہ بات شامل ہے کہ حضرت عثمان غنیؓ نے مصحف قرآنی کی جو کتابت کرائی تھی اور جو آج مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہے، وہ وہی قرآن ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل کیا گیا، نہ اس میں زیادتی و کمی کی گئی ہے اور نہ کوئی تبدیلی، علامہ ابن عبدالبرؒ فرماتے ہیں :

وأجمع العلماء أن ما في مصحف عثمان بن عفان، وهو الذي بأيدي المسلمين اليوم في أقطار الأرض حيث كانوا، هو القرآن المحفوظ الذي لا يجوز لأحد أن يتجاوزه، ولا تحل الصلاة لمسلم إلا بما فيه ... ويبين لك هذا أن من دفع شيئاً مما في مصحف عثمان كفر ۔(۱)

نیز علامہ ابن نجیم مصریؒ کا بیان ہے :

ويكفر إذا أنكر آية من القرآن أو سخر بآية منه إلا المعوذتين ففي إنكارهما اختلاف ۔ (۲)

---

(۱) التمهيد لما في الموطأ من المعاني والأسانيد: ۲۷۸/۴۔

(۲) البحر الرائق شرح كنز الدقائق: ۱۳۱/۵۔

۲- دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اہل سنت والجماعت کے نزدیک چوں کہ قرآن کریم براہ راست اللہ کا کلام ہے؛ اس لئے یہ قدیم ہے، مخلوق نہیں ہے، ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا، جو چیز مخلوق ہوتی ہے، وہ پہلے موجود نہیں ہوتی ہے، پھر وجود میں لائی جاتی ہے؛ لیکن چوں کہ کلام اللہ، اللہ کی صفت ہے اور اللہ تعالیٰ کی شان یہ ہے کہ اس کی صفات قدیم ہیں؛ اس لئے قرآن مجید بھی قدیم ہے؛ لیکن اس سے مراد کلام نفسی ہے اور وہی اللہ تعالیٰ کی صفت ہے، قرآن کی تلاوت کرتے ہوئے جن الفاظ کو نقل کیا جاتا ہے یا جسے تحریر کیا جاتا ہے، وہ قدیم نہیں ہے، کلام نفسی کیا ہے؟ اس کو ایک مثال سے سمجھا جاسکتا ہے، اگرچہ یہ مکمل مثال نہیں ہے؛ لیکن سمجھنے کے لئے عرض کیا جاتا ہے کہ جب ہم کلام کرتے ہیں یا اسے لکھتے ہیں، تو پہلے اس کے الفاظ ومعانی ہمارے ذہن میں نقش ہوتے ہیں، پھر ہم اس کو الفاظ یا تحریر کی شکل میں نقل کرتے ہیں، تو یہ جو ذہنی وجود ہے، اس سے کلام نفسی کو سمجھا جاسکتا ہے، واللہ اعلم۔

۳- اللہ تعالیٰ کی طرف سے بعض احکام ہر نبی کے ذریعہ دیئے گئے ہیں، جیسے: توحید، رسالت، آخرت وغیرہ، ان تعلیمات کو دین کہتے ہیں، دین ہمیشہ ایک ہی رہا ہے :

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَ مَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَ مُوْسٰى وَ عِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَ لَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ ۔ (شوریٰ:۱۳)

اور کچھ احکام وہ ہیں جو مختلف اُمتوں کے احوال کے اعتبار سے ان کے لئے دیئے گئے ہیں؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّ مِنْهَاجًا ۔ (مائدہ:۴۸)

ان احکام کو شریعت کہتے ہیں، بعض انبیاء کتاب کے ساتھ ساتھ نئی شریعت بھی لے کر آئے، جیسے: حضرت موسیٰ علیہ السلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، اور بعض کو کتابیں تو دی گئیں؛ لیکن نئی

شریعت نہیں دی گئی، جیسے: بیشتر انبیاءِ بنی اسرائیل، رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ جو شریعت آئی، جس کے احکام قرآن وحدیث میں مذکور ہیں، یہ آخری شریعت ہے، قیامت تک پوری انسانیت کے لئے اسی پر عمل کرنا واجب ہے؛ اس لئے کہ نبوت کا سلسلہ آپ ﷺ پر ختم ہو چکا ہے، اور قرآن مجید کو پوری انسانیت کے لئے نازل کیا گیا ہے، ان لوگوں کے لئے بھی جو اس وقت موجود تھے اور قیامت تک آنے والی انسانیت کے لئے بھی؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

وَ أُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَ مَنْۢ بَلَغَ ۔ (۱)

نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّ عَدْلًا لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ وَ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۔ (۲)

نیز رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اس وقت اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام ہوتے تو ان کو بھی میری ہی اتباع کرنی ہوتی:

لو كان موسىٰ حياً بين أظهركم ، ما حل له إلا أن يتبعني ۔ (۳)

اگر کوئی شخص قرآن مجید سے ثابت ہونے والے کسی حکم کا انکار کر جائے تو وہ مسلمان باقی نہیں رہے گا:

وَ مَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الْكٰفِرُوْنَ ۔ (۴)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

من جحد آية من القرآن فقد حل ضرب عنقه ۔ (۵)

---

(۱) انعام:۱۹۔ (۲) انعام:۱۱۵۔

(۳) مسند احمد عن جابر، حدیث نمبر:۱۴۶۳۱۔ (۴) عنکبوت:۴۷۔

(۵) سنن ابن ماجہ، حدیث:۲۵۳۹۔

تمرینی سوالات

(۱) گذشتہ آسمانی کتابوں پر ایمان لانے سے کیا مراد ہے؟

(۲) اگر کوئی قرآن پاک کو محرّف مانتا ہو تو کیا وہ مسلمان باقی رہے گا؟

(۳) قرآن قدیم ہے، اس سے کونسا کلام مراد ہے، کلامِ لفظی یا کلامِ نفسی؟

(۴) دین اور شریعت میں کیا فرق ہے؟



ملائکہ پر ایمان

''اَلوکہ'' کے معنی پیغام کے ہیں، اسی سے مَلَک ہے، جس کے معنی پیغام پہنچانے والے کے ہیں، مَلَک کی جمع ملائکہ ہے،(۱) ان کو ہم اردو میں فرشتہ کہتے ہیں؛ چوں کہ وہ مخلوق تک اللہ کا پیغام پہنچاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے حسب فرمان اسے نافذ کرتے ہیں؛ اس لئے ان کو مَلَک کہا گیا ہے، اور اسی لئے قرآن مجید میں ان کو رسول یعنی پیغام رساں سے بھی تعبیر کیا گیا ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس آنے والے فرشتوں کے بارے میں فرمایا گیا :

وَلَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى ۔ (ہود:۶۹)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پاس حضرت جبرئیل علیہ السلام کے وحی لانے کے بارے میں ارشاد ہوا: ''اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ''۔ (تکویر:۱۹)

اللہ تعالیٰ نے ان کو نور سے پیدا کیا ہے، جس کا خود حدیث میں ذکر آیا ہے: ''خلقت الملائکة من نور''(۲) اور نور سے مراد ہے ایک لطیف نورانی مادہ :

والمراد بالنور مادة نورانية ألطف وأشرف من النار ۔(۳)

متکلمین نے ملائکہ کی تعریف اس طرح کی ہے :

الملائكة أجسام لطيفة تظهر فى صور مختلفة ، وتقوى على أفعال شاقة ، هم عباد مكرمون ، يواظبون على الطاعة والعبادة ، ولا يوصفون بالذكورة والأنوثة ۔ (۴)

---

(۱) المعجم الوسیط:۱/۲۴۔ (۲) مسلم، حدیث:۲۹۹۶۔

(۳) نبراس:۲۸۷۔ (۴) شرح المقاصد:۳/۳۱۹۔

حاصل یہ ہے کہ :

☆ فرشتوں کا مادۂ تخلیق نور ہے۔

☆ وہ مختلف صورتوں میں ڈھل سکتے ہیں۔

☆ پُرمشقت کاموں کو انجام دے سکتے ہیں۔

☆ معصوم ہیں، ہمیشہ اللہ کی طاعت وعبادت میں لگے رہتے ہیں۔

☆ نہ مرد ہوتے ہیں اور نہ عورت۔

فرشتے تو بے شمار ہیں :

وَ مَا یَعۡلَمُ جُنُوۡدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ ۔ (المدثر:۳۱)

لیکن کچھ فرشتوں کے نام قرآن وحدیث میں ذکر فرمائے گئے ہیں اور کچھ فرشتوں کی ذمہ داریوں کا ذکر آیا ہے، جن فرشتوں کا نام آیا ہے، وہ یہ ہیں :

حضرت جبرئیل علیہ السلام، حضرت میکائیل علیہ السلام، حضرت اسرافیل علیہ السلام، ملک الموت (حضرت عزرائیل علیہ السلام)، حضرت رضوان علیہ السلام، حضرت مالک علیہ السلام۔

حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ذمہ اللہ تعالیٰ کا پیغام پیغمبر تک پہنچانا ہے، قرآن مجید میں ہے :

قُلۡ مَنۡ کَانَ عَدُوًّا لِّجِبۡرِیۡلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰی قَلۡبِكَ بِاِذۡنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیۡنَ یَدَیۡهِ وَ هُدًی وَّ بُشۡرٰی لِلۡمُؤۡمِنِیۡنَ ۔ (بقرہ:۹۷)

قرآن میں آپ کا نام روح (قدر:۴) اور الروح الامین (شوریٰ:۱۹۳) بھی آیا ہے۔

حضرت میکائیل علیہ السلام کا ذکر اس طرح فرمایا گیا ہے :

مَنۡ کَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَ مَلٰٓئِکَتِهٖ وَ رُسُلِهٖ وَ جِبۡرِیۡلَ وَمِیۡکٰلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلۡکٰفِرِیۡنَ ۔ (بقرہ:۹۸)

حضرت میکائیل علیہ السلام کے ذمہ بارش برسانا، بادل ہنکانا اور غلہ اُگانا وغیرہ ہے۔

قاضی علی بن علی ابی العز الدمشقیؒ فرماتے ہیں :

وميكائيل مؤكل بالقطر الذى به حياة الأرض والنبات والحيوان ـ (۱)

حضرت اسرافیل علیہ السلام کے ذمہ قیامت کے لئے صور پھونکنا ہے :

و إسرافيل مؤكل بالنفخ فى الصور الذى به حياة الخلق بعد مماتهم ـ (۲)

حضرت اسرافیل علیہ السلام کا نام حدیث میں آیا ہے :

اذا كان قام من الليل افتتح صلاته اللهم رب جبرائيل وميكائيل واسرافيل ـ (۳)

حضرت عزرائیل علیہ السلام، کا کام لوگوں کی روح قبض کرنا ہے، قرآن میں ان کا ذکر 'ملک الموت' کے نام سے ہے؛ چنانچہ ارشاد ہے :

قُلْ يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِىْ وُكِّلَ بِكُمْ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ ـ (سجدہ:۱۱)

حضرت مالک علیہ السلام دوزخ کے داروغہ ہیں؛ چنانچہ ارشاد ہے :

وَنَادَوْا يٰمٰلِكُ لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ قَالَ اِنَّكُمْ مّٰكِثُوْنَ ـ (۴)

حضرت رضوان علیہ السلام داروغہ جنت ہیں، حدیث میں ان کا ذکر آیا ہے :

إن الجنة لتنجد وتزين من الحول إلى الحول لدخول شهر رمضان ... ويقول الله عزوجل : يارضوان ! افتح أبواب الجنان ، ويا مالک ! أغلق أبواب الجحيم ـ (۵)

(۱) شرح عقیدۃ الطحاوی:۴۰۸۔ (۲) عقیدۃ الطحاوی:۳۰۱۔

(۳) مسلم،عن عائشہؓ،حدیث نمبر:۷۷۰۔ (۴) زخرف:۷۷۔

(۵) شعب الایمان،حدیث نمبر:۳۴۲۱۔

ہاروت وماروت نامی دوفرشتوں کا ذکر بھی قرآن میں آیا ہے :

وَ مَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَ مَارُوْتَ ۔ (۱)

کچھ فرشتے وہ ہیں جن کی مفوضہ ذمہ داریوں کا ذکر قرآن یا حدیث میں آیا ہے، وہ یہ ہیں :

۱- عرش الٰہی کے حاملین: آٹھ فرشتے وہ ہیں جو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کا عرش اُٹھائے ہوئے ہوں گے :

وَّالْمَلَكُ عَلٰٓى اَرْجَآئِهَا وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمٰنِيَةٌ ۔ (۲)

۲- کراماً کاتبین: ہر آدمی کے ساتھ دو فرشتے مقرر ہیں، جن میں ایک نیکیوں کو لکھتا ہے اور دوسرا گناہوں کو؛ چنانچہ ارشاد ہے :

وَ اِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ ، كِرَامًا كَاتِبِيْنَ ، يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ ۔ (۳)

۳- کچھ فرشتوں کو اللہ تعالیٰ نے انسان کا پہرہ دار اور محافظ مقرر کیا ہے، جو بہت سے حادثات سے انسان کی حفاظت کرتے ہیں؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَ مِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ ۔(۴)

۴- مُنکَر نکیر: قبر میں انسان سے جو سوال و جواب ہوگا، اس پر یہی فرشتے مامور ہیں، جن میں سے ایک کا نام مُنکَر اور دوسرے کا نام نکیر ہے؛ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا :

إذا قبر الميت أتاه ملكان أسودان أزرقان ، يقال لأحدهما : المنكر ، وللآخر : النكير ۔ (۵)

---

(۱) بقرہ:۱۰۲۔ (۲) حاقہ:۱۷۔

(۳) انفطار:۱۰-۱۲۔ (۴) رعد:۱۱۔

(۵) سنن ترمذی، حدیث:۱۰۷۱۔

۵- زبانیہ: دوزخ میں کچھ فرشتے اہل دوزخ کو عذاب دینے پر مامور ہوں گے، ان کا نام زبانیہ ہے؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

سَنَدۡعُ الزَّبَانِيَةَ ۔ (علق:۱۸)

ان کے علاوہ بھی مختلف خدمات پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرشتے مامور ہوں گے۔(۱)

لہٰذا جن فرشتوں کا نام آیا ہے یا ان کی ذمہ داریاں بیان کی گئی ہیں، ان پر اسی تفصیل کے ساتھ ایمان لانا مطلوب ہے، اور بقیہ فرشتوں پر اجمالی طور پر ایمان لانا واجب ہے:

أما من ورد تعيينه باسمه المخصوص كجبريل وميكائيل وإسرافيل، ورضوان، ومالك، ومن ورد تعيين نوعه المخصوص كحملة العرش، والحفظة والكتبة فيجب الإيمان بهم على التفصيل، وأما البقية فيجب الإيمان بهم إجمالاً، والله أعلم بعددهم لايحصى عددهم إلا هو ۔ (۲)

اسی سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ ملائکہ کا مستقل وجود ہے، اور وہ ایک خاص مخلوق ہیں، یہ سمجھنا درست نہیں ہے کہ انسان کے اندر جو جذباتِ خیر پائے جاتے ہیں، انھیں کو ملائکہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

جِنات اور شیاطین

''جِن'' بھی اللہ تعالیٰ کی ایک مخلوق ہیں، جیسے حضرت آدم علیہ السلام کو مٹی سے اور فرشتوں کو نور سے پیدا کیا گیا ہے، اسی طرح جن کی تخلیق آگ سے ہوئی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَخَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ ۔ (رحمٰن:۱۵)

(۱) دیکھئے: عقیدۃ الطحاوی مع الشرح:۳۰۰-۳۰۱۔ (۲) عقیدہ واسطیہ مع الشرح:۲۵۔

جِن بھی ایسی مخلوق ہے جو نظر نہیں آتی ہے، مگر انسان اُن کو نظر آتا ہے :

اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَ قَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ۔ (۱)

جِن کی کوئی مستقل شکل نہیں ہوتی؛ البتہ وہ مختلف شکلیں اختیار کرسکتا ہے، عام طور پر چند صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا :

الجن ثلاث أصناف : صنف لهم أجنحة يطيرون فى الهواء ، وصنف حيات وكلب ، وصنف يحلون ويظعنون ۔ (۲)

انسان سے پہلے زمین پر جنات ہی آباد تھے۔

وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ ۔ (حجر:۲۷)

انسان کی طرح جِن بھی ایمان لانے اور احکام شرعیہ پر عمل کرنے کے مکلف ہیں، ان میں مومن بھی ہیں اور کافر بھی، بعض جنات نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دست مبارک پر اسلام قبول کیا ہے اور ان کو صحابیت کا شرف حاصل ہوا ہے، (۳) جنوں کے قرآن مجید کی تلاوت سے متاثر ہونے کا ذکر خود قرآن میں موجود ہے :

قُلْ اُوْحِیَ اِلَیَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ فَقَالُوْٓا اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا ۔ (جن:۱)

ان میں انسانوں کی طرح صالح اور غیر صالح دونوں طرح کے افراد پائے جاتے ہیں :

وَّاَنَّا مِنَّا الصّٰلِحُوْنَ وَمِنَّا دُوْنَ ذٰلِكَ كُنَّا طَرَآئِقَ قِدَدًا ، وَّ اَنَّا ظَنَنَّآ اَنْ لَّنْ نُّعْجِزَ اللّٰهَ فِي الْاَرْضِ وَ لَنْ نُّعْجِزَهٗ هَرَبًا ، وَّ اَنَّا لَمَّا سَمِعْنَا الْهُدٰٓى اٰمَنَّا بِهٖ فَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِرَبِّهٖ فَلَا يَخَافُ بَخْسًا وَّ لَا رَهَقًا ، وَّ اَنَّا مِنَّا الْمُسْلِمُوْنَ وَ مِنَّا الْقٰسِطُوْنَ فَمَنْ اَسْلَمَ فَاُولٰٓئِكَ تَحَرَّوْا رَشَدًا ۔ (جن:۱۱-۱۴)

---

(۱) اعراف:۲۷۔

(۲) مستدرک حاکم عن ابی ثعلبہ خشنی، حدیث نمبر: ۳۷۰۲، وقال: ہذا حدیث صحیح الاسناد ولم یخرجاہ۔

(۳) المعجم الکبیر للطبرانی، حدیث نمبر:۱۱۶۶۔

اور اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی طرح جنوں کو بھی اپنے احکام کا مخاطب بنایا ہے :

سَنَفْرُغُ لَكُمْ اَيُّهَ الثَّقَلٰنِ ، فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ، يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ فَانْفُذُوْا لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ ، فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۔ (۱)

اسی لئے امام رازیؒ فرماتے ہیں: ''الجن مكلفون كالإنس''۔(۲)

'جن' کو بھی دوسری جاندار مخلوق کی طرح کھانے پینے کی ضرورت ہوتی ہے، اس کی رعایت کرتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا :

لا تستنجوا بالروث ولا بالعظام فإنه زاد إخوانكم الجن ۔ (۳)

ان میں بھی مرد وعورت ہیں اور توالد وتناسل کا نظام ہے؛ چنانچہ ارشاد ہے :

اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَ ذُرِّيَّتَهٗٓ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِيْ وَ هُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ ۔ (۴)

امام عبدالوہاب شعرانیؒ فرماتے ہیں :

وهم من الخلق الناطق يأكلون ويتناكحون ويتناسلون ۔ (۵)

انسان کی طرح صالح جِن بھی جنت میں داخل کئے جائیں گے، جس کا اشارہ: ''لَمْ يَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَ لَا جَآنٌّ'' (۶) میں موجود ہے، اور نافرمان جنوں کے دوزخ میں داخل کئے جانے کا ذکر بھی آیا ہے۔(۷)

لہٰذا :

جِن کو ایک مستقل مخلوق ماننا واجب ہے، اور اس کے وجود کا انکار کرنا کفر ہے۔

---

(۱) الرحمٰن: ۳۱-۳۴۔ (۲) تفسیر کبیر: ۱/ ۶۵۔

(۳) سنن ترمذی، باب كراهية ما يستنجى به، حدیث نمبر: ۱۸۔ (۴) کہف: ۵۰۔

(۵) اليواقيت والجواهر: ۱/ ۱۳۴۔ (۶) الرحمٰن: ۷۴۔

(۷) جن ۱۱-۱۵۔

المبحث الثالث والعشرون فی إثبات وجود الجن ووجوب الإیمان بهم ، وذلک إجماع أهل السنة سلفاً وخلفاً علی إثباتهم مع نطق القرآن وجمیع الکتب المنزلة بهم ۔ (۱)

شریر وسرکش جنوں ہی کو ''شیطان'' کہتے ہیں، ابلیس بھی شیطان ہی تھا، قرآن مجید نے ابلیس کے بارے میں کہا ہے :

كَانَ مِنَ الْجِنِّ ۔ (۲)

قیامت کے دن گنہگار اور کافر انسانوں کی طرح ان کو بھی دوزخ میں ڈالا جائے گا :

لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكَ وَمِمَّنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۔ (۳)

تمرینی سوالات

(۱) ملائکہ کا مادۂ تخلیق کیا ہے؟

(۲) ملائکہ الگ مخلوق ہیں یا انسان کے اندر پائے جانے والے جذبۂ خیر کو ملائکہ سے تعبیر کیا گیا ہے؟

(۳) قرآن وحدیث نے بعض ملائکہ کی خصوصی ذمہ داریوں کا ذکر کیا ہے، ان کی وضاحت کیجئے؟

(۴) کیا جن بھی ایک مخلوق ہے، اگر کوئی شخص جن کے وجود کا منکر ہو تو اس کا کیا حکم ہے؟



(۱) الیواقیت والجواہر: ۱/ ۱۳۴۔

(۲) کہف: ۵۰۔

(۳) ص: ۸۵۔

آخرت پر ایمان

آخرت کے معنی بعد میں آنے والی یا اخیر میں آنے والی چیز کے ہیں؛ اس لئے قیامت قائم ہونے (جس میں یہ کائنات ختم کردی جائے گی) اور اس کے بعد پیش آنے والے واقعات وحالات کو'آخرت' کہتے ہیں۔

آخرت کا تصور، عقل کی روشنی میں

یہ بات ظاہر ہے کہ انسان خود پیدا نہیں ہوا ہے، کسی ذات نے اسے پیدا کیا ہے اور دنیا کی ساری نعمتیں اس کے لئے فراہم کی ہیں، خود دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ انسان ایک سوئی بھی بناتا ہے تو بے مقصد نہیں بناتا، تو کیا دنیا بے مقصد پیدا کی گئی ہے؟ دنیا کے تقریباً تمام مذاہب نے اس کا جو جواب دیا ہے، وہ یہ ہے کہ خالق کائنات نے اس دنیا کو انسان کے امتحان کے لئے پیدا فرمایا ہے، اس نے ایک طرف انسان کی جسمانی سہولتوں کے لئے اس کائنات میں نوع بنوع نعمتیں پیدا کی ہیں، دوسری طرف انبیاء کے ذریعہ زندگی گزارنے کا طریقہ اسے بتایا ہے اور اس پر عمل کرنے کا پابند بنایا ہے۔

اس امتحان کا تقاضا ہے کہ اس دنیا کے بعد کوئی ایسی دنیا بھی ہو، جہاں فرمانبرداری کرنے والوں کو اپنے نیک عمل پر انعام ملے اور نافرمانی کرنے والوں کو اپنے گناہ کی سزا ملے، اسی کے لئے آخرت کا عالم رکھا گیا ہے، یہ بات خالق کائنات کی حکمت سے بعید ہے کہ وہ نہ بندے کی نیکی پر اجر دے اور نہ گناہ پر کوئی سزا، خود انسان کی فطرت بھی یہی چاہتی ہے، ہم شب و روز دیکھتے ہیں کہ انسان اپنے محسنوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا چاہتا ہے، اور نقصان پہنچانے والے سے بدلہ لینا چاہتا ہے؛ اس لئے آخرت کا قائم ہونا اللہ تعالیٰ کی حکمت اور کائنات کی فطرت کا تقاضا ہے۔

اگر غور کیا جائے تو دنیا میں کسی نیکی کا مکمل بدلہ اور کسی برائی کی مکمل سزا مل ہی نہیں سکتی، مثلاً: فرض کریں ایک شخص ایسی بیماری میں مبتلا ہو کہ اس کو فوری طور پر آپریشن کی ضرورت ہے؛ ورنہ اس کے مرجانے کا اندیشہ ہے، آپ نے اسے علاج کے لئے ۵/لاکھ روپے دے دیئے، وہ علاج کے بعد صحت مند ہو گیا اور اس نے صحت یاب ہونے کے بعد تیس چالیس سال کی عمر پائی، اس میں اس نے کروڑوں روپے کمائے، اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلائی، ان کے مستقبل کو سنوارا، اور پھر اس کی نسل میں تعلیم کا سلسلہ جاری ہو گیا، لوگوں نے تعلیم کی بنا پر اچھے روزگار حاصل کئے، اب یہ شخص اپنے اس محسن کو ۵/لاکھ روپے واپس کر سکتا ہے، ہوسکتا ہے ۵/لاکھ کی بجائے ۱۰/لاکھ روپے اپنی طرف سے دے دے؛ لیکن کیا یہ ۳۰-۴۰/سال کی زندگی کا، کروڑوں روپے کی کمائی کا اور نسل در نسل تعلیم کا سلسلہ جاری ہونے کا بدلہ ہوسکتا ہے؟

اسی طرح ایک ظالم نے کسی کو قتل کر دیا، زیادہ سے زیادہ سزا کے طور پر اسے قتل کیا جاسکتا ہے؛ لیکن اس نے جس شخص کو قتل کیا تھا، اس کی بیوی بیوہ ہوئی، اس کے چھوٹے چھوٹے بچے یتیم ہو گئے، اس کے بوڑھے ماں باپ بے سہارا ہو گئے، بچے تعلیم سے محروم ہو گئے، اس کی وجہ سے وہ مناسب روزگار سے بھی محروم ہوئے اور پھر اس کی اگلی نسل میں بھی تعلیم کا سلسلہ آگے نہیں بڑھ سکا تو کیا ان مظالم کی سزا اِس دنیا میں اُس ظالم کو مل سکتی ہے؟

اس سے معلوم ہوا کہ اس دنیا میں نہ اچھے عمل کرنے والوں کو پوری جزا مل سکتی ہے اور نہ ظلم و گناہ کرنے والوں کو پوری سزا دی جاسکتی ہے؛ اس لئے ایک ایسے عالَم کی ضرورت ہے، جس میں اچھے عمل کرنے والوں کو پوری پوری جزا ملے اور بُرے عمل کرنے والوں کو پوری پوری سزا ملے، وہ عالمِ آخرت ہے؛ اسی لئے قرآن مجید نے بار بار کہا ہے کہ آخرت میں نیکیوں کی پوری جزا ملے گی اور گناہ کرنے والوں کو پوری پوری سزا ملے گی، (حج:۴۷) اس لئے حقیقت یہ ہے کہ عدل وانصاف کے تقاضے اس وقت تک پورے نہیں ہو سکتے، جب تک کہ آخرت قائم نہ ہو اور اسی لئے وہاں اہلِ ایمان کو ہمیشہ کے لئے جنت میں جگہ دی جائے گی، جس میں انسان کے تصور سے بڑھ کر نعمتیں ہوں گی اور کفار اور اللہ کی نافرمانی کرنے والوں کو ہمیشہ کے لئے دوزخ ہوگی۔

اسلام کے تصور آخرت کے سلسلہ میں عقل کے پرستاروں کو سب سے بڑا اشکال یہ ہے کہ انسان کو مرنے کے بعد دوبارہ کس طرح زندہ کیا جا سکتا ہے جب کہ اس کے اجزاء بکھر چکے ہوں گے اور عجب نہیں کہ مٹی کے ذرات، جانور کی خوراک اور سمندر میں تیرنے والے تنکے بن گئے ہوں، پھر کیوں کر ممکن ہے کہ ان کو دوبارہ پہلی صورت پر لایا جائے؟ لیکن یہ بات اصل میں انسان اللہ کی قدرت کو اپنی صلاحیت اور طاقت پر قیاس کرتے ہوئے کہتا ہے؛ حالاں کہ انسان کی طاقت کو اللہ کی قدرت سے کوئی نسبت نہیں، ہم دنیا میں دن رات دیکھتے ہیں کہ ایک پیچیدہ مشین کو بنانے والا یا اس کا کاریگر مشین کے ایک ایک پرزے کے بکھر جانے کے بعد بھی اسے دوبارہ جوڑ سکتا ہے، تو کیا اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر نہیں ہیں کہ انسان کو موت دینے کے بعد دوبارہ زندگی عطا فرما دیں؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

وَهُوَ الَّذِیْ یَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ یُعِیْدُهٗ وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَیْهِ ۔ (۱)

اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے :

مَا خَلْقُكُمْ وَ لَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ ۔ (۲)

اس لئے آخرت کا عقیدہ قطعاً عقل کے خلاف نہیں ہے۔

دنیوی زندگی میں عقیدۂ آخرت کا اثر

آخرت کا عقیدہ ایک حقیقت تو ہے ہی؛ لیکن اس دنیا میں امن وانصاف قائم رکھنے کے لئے بھی یہ تصور ضروری ہے؛ کیوں کہ انسان کی فطرت میں شہوت پرستی رکھی گئی ہے، اس کی وجہ سے اس میں ظلم کا داعیہ پیدا ہوتا ہے اور وہ دوسروں کی جان ومال، عزت وآبرو پر قبضہ کرنا چاہتا ہے، قانون کی طاقت انسان کو اس سے باز رکھنے کی کوشش کرتی ہے؛ لیکن جہاں کسی وجہ سے قانون کی حکمرانی قائم نہ ہو، یا ہو؛ لیکن انسان قانون کی حفاظت کرنے والی آنکھوں سے دُور ہو تو وہاں کوئی چیز اسے ظلم سے باز نہیں رکھ سکتی، ایسے موقع پر آخرت کا تصور ظلم کرنے

(۱) روم: ۲۷۔ (۲) لقمان: ۲۸۔

والے ہاتھ کو تھام لیتا ہے اور فساد برپا کرنے والے قدموں کو روک لیتا ہے؛ اسی لئے جو لوگ دنیا کے اعمال پر جزاء وسزا کا تصور رکھتے ہیں، ان کی زندگی ظلم وفساد اور جور وجفا سے نسبتاً زیادہ محفوظ ہوتی ہے۔

نظریہ تناسخ

ہندوستان کے بعض مذاہب آواگون (عقیدۂ تناسخ) کے قائل ہیں، بعض قدیم فلاسفہ بھی اس کے قائل تھے، تناسخ کا حاصل یہ ہے کہ زندگی کا اس کائنات میں دائمی وجود ہے؛ البتہ جیسے انسان لباس تبدیل کرتا ہے، اسی طرح روح جسم کو تبدیل کرتی رہتی ہے، اس دنیا میں جو انسان چرند و پرند اور نباتات ہیں، یہ سب ان کے خیال میں آواگون کا نتیجہ ہیں، یہ گزشتہ جنم میں انسان ہی تھے، مگر اپنے اعمال کی وجہ سے موجودہ جنم میں درخت اور جانور کی شکل میں پیدا ہوگئے ہیں، اسی طرح اگر کوئی شخص غریب اور بیمار ہے تو یہ پچھلے جنم کے اعمال (کرموں) کا نتیجہ ہے، گویا انسان کی نیکیوں کی جزا اور گناہوں کی سزا اسی دنیا میں دوسرے جنم کی شکل میں دی جاتی ہے۔

یہ تصور کئی وجوہ سے غلط ہے :

۱- کائنات میں جو حیوانات اور نباتات ہیں، وہ انسان کی ضرورت ہیں، ان ہی سے ہمیں دُودھ، گوشت، اناج، پھل اور ترکاریوں جیسی غذا اور لباس کے لئے چمڑوں کے یا کاٹن کے ملبوسات حاصل ہوتے ہیں، اگر ان مخلوقات کے وجود کو آواگون کا نتیجہ سمجھا جائے تو اس کا یہ مطلب ہے کہ انسان کو گناہوں کا ارتکاب کرنا چاہئے، جو مفسدین ہیں ان کو اپنے ظلم وفساد میں اضافہ کرنا چاہئے؛ کیوں کہ دنیا کو اپنی بنیادی ضرورتوں کے لئے ان مخلوقات میں اضافہ کی ضرورت ہے اور وہ گناہوں کے ارتکاب ہی سے حاصل ہوسکتا ہے۔

۲- انعام کے لئے یہ بات ضروری ہے کہ جسے انعام دیا جائے، اسے معلوم ہو کہ وہ کیوں اِس انعام کا مستحق ہوا ہے؛ تاکہ یہ اس کے لئے تسکین کا اور دوسروں کے لئے ترغیب کا باعث بن سکے، اسی طرح جس کو سزا دی جارہی ہے، وہ واقف ہو کہ اسے کس جرم کی سزا مل رہی

ہے؛ تاکہ اس کے لئے تنبیہ اور دوسروں کے لئے سبق ہو؛ لیکن آج جو شخص دولت، عیش و آرام اور خوشحالی کی زندگی گزار رہا ہے، نہ اس کو معلوم ہے کہ یہ اس کی کن نیکیوں کا صلہ ہے، اور نہ دوسروں کو اس کا علم ہے، اور آج جو شخص تنگی، بیماری اور جہالت سے دوچار ہے، اس کو معلوم نہیں ہے کہ اس نے پچھلے جنم میں کیا غلطی کی تھی؟ کیا اس طرح سزا و جزا کے مقاصد اور تقاضے پورے ہو سکیں گے؟ اور پھر جو جانور اور نباتات ہمارے سامنے ہیں، وہ تو بے شمار بھلائیوں کے کام کرتے ہیں، وہ دُودھ دیتے ہیں، لوگوں کو منزل تک پہنچاتے ہیں، پھول اور پھل دیتے ہیں، ہمیں آلودگی سے بچانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں تو کیا فلاح و بہبود کے ان کاموں کو انجام دینا گناہ کی سزا ہے؟

۳- انسان کی اخلاقی کیفیت پر اس عقیدہ کا بے حد منفی اثر پڑے گا، اگر ایک شخص مالدار، صحت مند اور باعزت زندگی کا حامل ہے، دوسرا شخص غریب، بیمار اور سماج میں عزت سے محروم ہے، تو جو بہتر حالت میں ہے، اس کے اندر تکبر پیدا ہوگا کہ یہ خدا کا فضل نہیں ہے؛ بلکہ اس کے عمل کا نتیجہ ہے، اور دوسرے شخص کے بارے میں محبت اور رحم دلی کا جذبہ پیدا ہونے کی بجائے نفرت اور تحقیر کا جذبہ پیدا ہو جائے گا؛ کیوں کہ وہ سمجھے گا کہ اس کی یہ حالت اسی کی بداعمالیوں کا نتیجہ ہے۔

۴- تاریخ میں کتنے ہی نیک اور پاک لوگ گزرے ہیں، جن کو سخت تکلیفوں، مصیبتوں اور بیماریوں سے گزرنا پڑا، اگر آواگون کے نظریے کو تسلیم کر لیا جائے تو ماننا پڑے گا کہ وہ گزشتہ جنم میں بہت خراب اور گناہ گار لوگ تھے، اس طرح خدا کے نیک بندوں اور مقدس مذہبی شخصیتوں کی زندگی کو بھی پاپ کا نتیجہ ماننا ہوگا۔

۵- اگر انسان جرائم اور گناہوں کی وجہ سے جانور اور پیڑ پودے بن جاتا ہے تو ہونا یہ چاہئے کہ جوں جوں دنیا میں جرائم بڑھتے جائیں، انسانی آبادی خود بخود کم ہوتی جائے اور پیڑ پودوں کی تعداد بڑھتی جائے؛ حالاں کہ ایسا نہیں ہے، جرائم بھی بڑھتے جا رہے ہیں، اور انسانی آبادی میں بھی اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے اور جنگلات اور پیڑ پودے کم ہوتے جا رہے ہیں۔

۶- آواگون کا نظریہ اس بات پر مبنی ہے کہ جو ارواح پیدا ہو چکی ہیں، وہی مختلف جسموں میں حلول کرتی جارہی ہیں، یہ بات اللہ تعالیٰ کی قدرت میں نقص کو ظاہر کرتی ہے کہ جو ارواح پیدا ہو چکی ہیں، خدا اب ان کے بعد مزید ارواح کو پیدا کرنے سے قاصر ہے، ظاہر ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی شان کے خلاف ہے؛ حالاں کہ جن مذاہب میں بھی خدا کا تصور ہے، ان میں خدا کو قادر مطلق ذات مانا گیا ہے۔

۷- اس عقیدہ سے یہ تصور اُبھرتا ہے کہ انسان کا گناہ کرنا خدا کے قانون کے تحت ایک ضرورت ہے؛ کیوں کہ خدا اِن جنگلات اور حیوانات کو انسان کے گناہ کے بغیر وجود ہی میں نہیں لا سکتا اور کائنات کو ان مخلوقات کی ضرورت ہے؛ لہٰذا گناہ کرنا انسان کی کوتاہی نہیں؛ بلکہ خدا کی ضرورت ہے۔

۸- اس عقیدہ کی وجہ سے دنیا کی بہت سی وہ مخلوقات ـــــ جو ہمیں راحت و آرام مہیا کرتی ہیں ـــــ انسان کے لئے قابل نفرت قرار پائیں گی، جیسے: درخت اور مویشی، جب خیال پیدا ہوگا کہ یہ پچھلے جنم کے گناہوں کے نتیجہ میں اس صورت میں پائی جارہی ہیں تو جانوروں کے ساتھ محبت وشفقت اور درختوں اور پیڑ پودوں کو ترقی دینے کی بجائے ان کے ساتھ سنگ دلی کا جذبہ پیدا ہوگا اور انسان کو یہ بات بہتر محسوس ہوگی کہ وہ ان کو فنا کے گھاٹ اُتار دے، یا تکلیف دہ اور رسوا کن طریقوں پر ان کا استعمال کرے۔

۹- اس سے انسانی معاشرے میں جرم وسزا کے قانون کی معنویت ختم ہو جائے گی؛ کیوں کہ اس سے یہ تصور اُبھرے گا کہ اگر 'الف' نے 'ب' کو قتل کر دیا تو ''ب'' کا مقتول ہونا 'الف' کے جرم کا نتیجہ نہیں ہے؛ بلکہ یہ پچھلے جنم میں اس سے صادر ہونے والے گناہ کا نتیجہ ہے۔

۱۰- سائنس اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ انسان کے پیدا ہونے سے ہزاروں سال پہلے کائنات پیدا ہو چکی تھی، قرآن مجید سے بھی ہمیں یہی معلوم ہوتا ہے کہ دنیا پہلے سے موجود تھی، پھر پہلے انسان حضرت آدم علیہ السلام پیدا کئے گئے اور زمین میں اُتارے گئے، تناسخ کے تصور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسان سے پہلے جو درخت اور دوسری اشیاء دنیا میں موجود تھیں،

یہ کیسے پیدا ہوئیں؟ اگر یہ انسان کی بدلی ہوئی شکل ہوتیں تو پہلے انسان کو وجود میں آنا چاہئے تھا نہ کہ کائنات کی دوسری چیزوں کو۔

آخرت پر ایمان سے مراد

آخرت پر ایمان متعدد باتوں کو شامل ہے، مرنے کے بعد عالم برزخ میں سوال وجواب اور ثواب وعذاب، قیامت سے پہلے بعض غیر معمولی علامتوں کا ظہور، کائنات کا درہم برہم کیا جانا، بعث بعد الموت، قیامت کے دن پیش آنے والے واقعات اور جنت ودوزخ۔

برزخی زندگی

قرآن وحدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دنیا میں آنے کے بعد انسان کو دو وقفہ زندگی سے گزرنا ہوتا ہے، ایک: دنیوی زندگی، جس میں اس وقت ہم لوگ ہیں، دوسرے: برزخی زندگی، جو ہماری موت سے شروع ہوگی اور قیامت آنے تک برقرار رہے گی، یہ دونوں زندگیاں عارضی ہیں، قیامت کے قائم ہونے کے بعد جو زندگی شروع ہوگی، وہ ہمیشہ کی زندگی ہوگی، برزخ کے معنی پردہ اور رکاوٹ کے ہیں، جیسے: اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ جہاں میٹھے اور کھارے پانی کا دریا جمع ہوتا ہے تو ہم ان دونوں کے درمیان ایک پردہ ڈال دیتے ہیں، اس طرح دونوں پانی ایک ساتھ چلنے کے باوجود ایک دوسرے سے الگ الگ چلتے رہتے ہیں:

وَهُوَ الَّذِىْ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّ هٰذَا مِلْحٌ
اُجَاجٌ وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَّحِجْرًا مَّحْجُوْرًا ۔ (فرقان: ۵۳)

برزخی زندگی چوں کہ دنیا وآخرت کے درمیان ایک وقفہ ہے؛ اس لئے اس کو ''برزخ'' کہتے ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ۔ (مومنون: ۱۰۰)

قبر میں سوال وجواب

مکمل حساب وکتاب اور جزاء وسزا تو آخرت میں ہوگی؛ لیکن ابتدائی سوال وجواب قبر میں بھی ہوگا، سوال ہوگا کہ تمہارا رب کون ہے؟ تمہارا دین کیا ہے؟ اور خاص طور پر رسول اللہ ﷺ

کے بارے میں دریافت کیا جائے گا؛ چنانچہ حضرت براء بن عازب ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا :

المسلم إذا سئل فی القبر یشهد أن لا إله إلا الله وأن محمداً رسول الله ، فذلک قوله تعالیٰ : ''یثبت الله الذین آمنوا بالقول الثابت فی الحیاة الدنیا وفی الآخرة'' ۔ (۱)

وفی روایة عن النبی صلی الله علیه وسلم قال : ''یثبت الله الذین آمنوا بالقول الثابت'' نزلت فی عذاب القبر ، یقال له : من ربک ؟ فیقول : ربی الله ، ونبیی محمد ۔ (۲)

سوال وجواب کے بعد قبر میں ثواب وعذاب بھی دیا جائے گا؛ چنانچہ حضرت ابو ہریرہ ؓ کی ایک تفصیلی حدیث میں ہے :

... فیقولان : قد کنا نعلم أنک تقول هذا ، ثم یفسخ له فی قبره سبعون ذراعاً فی سبعین ، ثم ینور له فیه ، ثم یقال له : نعم ، فیقول : أرجع إلی أهلی فأخبرهم ، فیقولان : نم کنومة العروس الذی لا یوقظه إلا أحب أهله إلیه ، حتی یبعثه الله من مضجعه ذلک ، و إن کان منافقاً ، قال : سمعت الناس یقولون قولاً فقلت مثله ، لا أدری ، فیقولان : قد کنا نعلم أنک تقول ذلک ، فیقال للأرض : التئمی علیه ، فتلتئم علیه مختلف أضلاعه ، فلا یزال فیها معذبا حتی یبعثه الله من مضجعه ذلک ۔ (۳)

---

(۱) بخاری، حدیث نمبر: ۱۳۰۳۔ (۲) مسلم، حدیث نمبر: ۲۸۷۱۔

(۳) ترمذی، حدیث نمبر: ۱۰۷۱۔

اوپر حضرت براء بن عازبؓ کی جو حدیث گزری ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قبر میں سوال و جواب کا ذکر خود قرآن مجید میں بھی موجود ہے اور ''القول الثابت'' (ابراہیم:۲۷) سے اسی کی طرف اشارہ ہے۔

قبر میں گناہ گاروں پر عذاب کا ہونا اہل سنت والجماعت کا متفقہ عقیدہ ہے، حدیثیں تو اس سلسلہ میں کثرت سے منقول ہیں؛ لیکن قرآن مجید میں بھی عذاب قبر کا ذکر آیا ہے، اللہ تعالیٰ نے فرعون کے بارے میں کہا :

اَلنَّارُ یُعۡرَضُوۡنَ عَلَیۡهَا غُدُوًّا وَّ عَشِیًّا وَ یَوۡمَ تَقُوۡمُ السَّاعَةُ اَدۡخِلُوۡۤا اٰلَ فِرۡعَوۡنَ اَشَدَّ الۡعَذَابِ ۔ (غافر:۴۶)

فرعون پر اس عذاب کا ذکر ایک اور آیت میں بھی آیا ہے :

مِمَّا خَطِیۡٓـٰٔتِهِمۡ اُغۡرِقُوۡا فَاُدۡخِلُوۡا نَارًا فَلَمۡ یَجِدُوۡا لَهُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اَنۡصَارًا ۔ (نوح:۲۵)

عذابِ قبر کے سلسلہ میں یوں تو بہت سی احادیث ہیں ؛ لیکن اہم بات یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خاص طور پر عذاب قبر سے محفوظ رہنے کی دُعاء کرنے کی تلقین فرمایا کرتے تھے ؛ چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے :

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم : إذا تشهد أحدكم فليستعذ بالله من أربع يقول : اللهم إني أعوذبك من عذاب جهنم ، ومن عذاب القبر ، ومن فتنة المحيا والممات ، ومن شر فتنة المسيح الدجال ۔ (۱)

قبر سے مراد برزخ کی زندگی ہے، خواہ مردہ کو زمین کھود کر اس میں دفن کیا گیا ہو، جس کو ہم لوگ اپنی اصطلاح میں 'قبر' کہتے ہیں، یا کسی اور طریقہ پر، جیسے: ڈوب کر، جل کر، یا درندہ کے کھا لینے کی وجہ سے اس کی موت ہوئی ہو، مرنے کے بعد اس کا جسم یا جسم کے ذرات جس حالت میں بھی ہوں، اس کا شمار قبر یعنی برزخ میں ہے؛ چنانچہ علامہ ابن ابی العزؒ فرماتے ہیں :

---

(۱) صحیح مسلم، حدیث نمبر:۵۸۸۔

واعلم أن عذاب القبر هو عذاب البرزخ ، فكل من مات وهو مستحق للعذاب ناله نصيبه منه ، قبر أو لم يقبر ، أكلته السباع أو احترق حتى صار رماداً ونسف في الهواء أو صلب أو غرق في البحر ، ويصل روحه وبدنه من العذاب ما يصل إلى المقبور ۔ (۱)

عالم برزخ میں عذاب وثواب کا تعلق اصل میں روح سے ہوگا؛ لیکن ایک گونہ اس کا تعلق جسم سے قائم رہے گا، دنیوی زندگی میں جسم کو جو تکلیف ہوتی ہے، وہ بھی روح کے واسطہ ہی سے ہوتی ہے؛ اس لئے روح کی راحت اور تکلیف معمولی چیز نہیں ہے؛ اس لئے یہ شبہ نہیں ہونا چاہئے کہ قبر کا ثواب وعذاب نظر نہیں آتا، دنیا میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ انسان بعض ایسی بیماریوں میں مبتلا ہوتا ہے کہ مریض خود تو اس کو شدت سے محسوس کرتا ہے؛ لیکن تیماردار محسوس نہیں کر پاتے، خواب اگرچہ مکمل طور پر عالم برزخ کے ثواب وعذاب کی مثال نہیں ہے؛ لیکن اس سے اس مسئلہ کو سمجھا جاسکتا ہے، خواب میں انسان کسی تکلیف دہ چیز کو دیکھتا ہے تو تکلیف محسوس کرتا ہے، بعض دفعہ تو نیند ہی میں چیخنا چلانا شروع کر دیتا ہے، اور کوئی خوش کن منظر دیکھتا ہے تو نیند میں ہنسنا، مسکرانا یا تعریفی کلمات کہنا شروع کر دیتا ہے اور اس کے پاس بیٹھے یا لیٹے ہوئے لوگوں کو وہ چیزیں نظر نہیں آتیں جو خواب دیکھنے والا دیکھتا اور محسوس کرتا ہے۔

قیامت کی علامتیں

اللہ تعالیٰ کی حکمت ورحمت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ انسان پر جو تکلیف دہ واقعات پیش آنے والے ہوتے ہیں، بندوں کو قبل از وقت ان کی اطلاع نہیں دی جاتی؛ کیوں کہ تکلیف کا انتظار اور اس کا خوف اصل تکلیف سے زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے، اس کا اندازہ اُن لوگوں کے بیان سے ہوتا ہے، جن کو پھانسی کی سزا سنائی جاتی ہے؛ اس لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ تاریخ متعین طور پر نہیں بتائی گئی، جس میں قیامت برپا کی جائے گی؛ چنانچہ ارشاد ہے :

---

(۱) شرح الطحاویہ:۳۹۶۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰهَا قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ لَا يُجَلِّيْهَا لِوَقْتِهَآ اِلَّا هُوَ ثَقُلَتْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَا تَاْتِيْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً يَسْـَٔلُوْنَكَ كَاَنَّكَ حَفِيٌّ عَنْهَا قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۔ (اعراف:۱۸۷)

البتہ رسول اللہ ﷺ نے علامتیں ذکر فرمائی ہیں، جن کو 'اشراط ساعۃ' کہا جاتا ہے، ان میں کچھ شرطیں تو عمومی نوعیت کی ہیں، جو عام حالات میں بھی پیش آتی رہتی ہیں، جیسے: آپ نے زنا اور شراب کی کثرت، خیانت کے غلبہ اور نااہل لوگوں کے فرماں روا بن جانے کا ذکر فرمایا ہے، ان علامات کو 'علاماتِ صغریٰ' کہتے ہیں، دوسری قسم کی علامتیں وہ ہیں، جن میں کسی متعین غیر معمولی واقعہ کے پیش آنے کا ذکر فرمایا گیا ہے، ان کو 'علاماتِ کبریٰ' کہتے ہیں، ان کا تذکرہ حضرت حذیفہؓ کی روایت میں ہے :

اطلع النبی صلی اللہ علیه وسلم علینا ونحن نتذاکر ، فقال : ما تذاکرون ؟ قالوا : نذکر الساعة ، قال : إنها لن تقوم حتی تروا قبلها عشر آیات : فذکر : الدخان ، والدجال ، والدابة ، وطلوع الشمس من مغربها ، ونزول عیسی بن مریم ، ویاجوج وماجوج ، وثلاثة خسوف : خسف بالمشرق وخسف بالمغرب ، وخسف بجزیرة العرب ، وآخر ذلک نار تخرج من الیمن تطرد الناس إلی محاشرهم ۔ (۱)

ان پیشین گوئیوں کی تفصیل شروح حدیث میں موجود ہے، اور یقیناً ان نشانیوں کا ظاہر ہونا حق ہے؛ لیکن بعض فرق باطلہ کے پیدا ہونے کی وجہ سے ان میں سے تین پیشین گوئیاں اعتقادی اعتبار سے خاص اہمیت کی حامل ہیں : امام مہدی کا ظہور، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول، دجال کا ظہور اور اس کا قتل۔

---

(۱)　صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۲۹۰۱۔

ظہورِ مہدی

قربِ قیامت میں امام مہدی ظاہر ہوں گے، یہ نبی نہیں ہوں گے؛ بلکہ اپنے عہد کے خلیفہ راشد ہوں گے، حدیث میں ان کی علامات خاص طور پر واضح کی گئی ہیں، ان کا نام محمد اوران کے والد کا نام عبد اللہ ہوگا ، وہ حضرت حسن بن علیؓ کی نسل سے ہوں گے، حجر اسود اور مقام ابراہیم کے درمیان لوگ ان کے ہاتھ پر بحیثیت امیر بیعت کریں گے، ان سے پہلے پوری دنیا میں ظلم وجور کا دور دورہ ہوگا ، وہ جزیرۃ العرب سے ہوتے ہوئے دنیا کے بڑے علاقہ کو فتح کرلیں گے اور دنیا کو عدل وانصاف سے بھر دیں گے۔

ان کی امارت قائم ہونے کے سات سال بعد دجال ظاہر ہوگا ، اس کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے نازل ہوں گے اور دجال کو قتل کریں گے۔

اس سے معلوم ہوا کہ :

(الف) امام مہدی کا ظہور حق ہے۔

(ب) امام مہدی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام دو الگ شخصیتیں ہیں، ایسا نہیں ہے کہ امام مہدی ہی حضرت عیسیٰ بھی ہوں، جیسا کہ مرزا غلام احمد قادیانی کا دعویٰ ہے کہ وہ مہدی بھی ہے اور مسیح بھی، یہ جھوٹا دعویٰ ہے۔

(ج) امام مہدی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اُمتی ہوں گے اور عادل حکمراں ہوں گے، نبی نہیں ہوں گے، جیسا کہ مرزا غلام احمد قادیانی نے مہدویت اور مسیحیت کی آڑ میں نبوت کا دعویٰ کیا ہے۔

(د) امام مہدی مذکورہ علامات کے حامل ہوں گے، ابھی تک سید محمد جونپوری کے بہ شمول جن لوگوں نے مہدی ہونے کا دعویٰ کیا ہے ان کا دعویٰ غلط اور باطل ہے؛ کیوں کہ نہ ابھی دجال کا ظہور ہوا اور نہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول؛ اسی لئے سید محمد جونپوری کو امام مہدی قرار دینا غلط ہے۔

(ہ) امام مہدی کی ایک عام انسان کی طرح ولادت ہوگی، ابھی ان کی ولادت ہوئی

نہیں ہے؛ اس لئے شیعہ حضرات کا امام محمد بن حسن عسکری کے بارے میں کہنا کہ وہ ایک غار میں چھپے ہوئے ہیں اور وہی امام مہدی کے طور پر ظاہر ہوں گے، درست نہیں ہے۔

امام مہدی کا ظاہر ہونا حدیث متواتر سے ثابت ہے؛ چنانچہ حافظ ابو الحسن الابریؒ (متوفی: ۳۶۳ھ) فرماتے ہیں :

قد تواترت الأخبار واستفاضت عن رسول الله صلى الله عليه وسلم بذكر المهدى ، وأنه من أهل بيته ، وأنه يملك سبع سنين ، وأنه يملأ الأرض عدلاً ، وأن عيسىٰ عليه السلام يخرج فيساعده على قتل الدجال ، وأنه يؤم هذه الأمة ويصلي عيسى خلفه ۔ (۱)

علامہ شوکانیؒ نے لکھا ہے کہ بحیثیت مجموعی مہدی کے سلسلہ میں پچاس حدیثیں منقول ہیں، جن میں صحیح بھی ہیں، حسن بھی ہیں، اور قابل قبول ضعیف بھی ہیں، نیز ان کے علاوہ صحابہ کے آثار بھی ہیں۔ (۲)

اس لئے یہ بات کہ قرب قیامت میں امام مہدی کا ظہور ہوگا، وہ حضرت فاطمہؓ کی نسل سے ہوں گے، وہ دجال سے جہاد کریں گے، اور ان کے زمانے میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول ہوگا، اہل سنت والجماعت کے متفقہ عقائد میں سے ہے۔

دجال کا خروج

دجل کے معنی دھوکہ اور مکر وفریب کے ہیں، اسی سے دجال ہے، جس کے معنی جھوٹے، فریبی اور مفسد کے ہیں، احادیث میں قیامت سے پہلے ظاہر ہونے والے جن بڑے واقعات کا ذکر آیا ہے، ان میں ایک دجال کا خروج بھی ہے، یہ ایک آنکھ کا کانا ہوگا اور ایک آنکھ پچکی ہوئی ہوگی، (۳) اس کی پیشانی پر ’ک ف ر‘ لکھا ہوا ہوگا، جسے ہر مسلمان پڑھ سکے گا۔ (۴)

---

(۱) اشراط الساعۃ: ۲۶۱۔ (۲) دیکھئے: التوضیح فی تواتر ما جاء فی المہدی المنتظر۔

(۳) صحیح البخاری، کتاب الفتن، باب ذکر الدجال: ۱۳/ ۱۰۹۰ شرح الفتح۔

(۴) مسلم کتاب الفتن، باب ذکر الدجال: ۱۸/ ۵۹، مع شرح النووی۔

وہ اصفہان کے قصبہ یہودیہ سے نکلے گا، وہاں ستر ہزار یہودی اس کے متبع ہوجائیں گے، (۱) وہ خدائی کا دعویٰ کرے گا اور اپنے فتنہ وفساد سے پوری دنیا کو روند ڈالے گا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو خصوصی ڈھیل ہوگی اور وہ خارق عادت چیزوں کے دیکھانے پر قادر ہوگا، یہاں تک کہ وہ ایک شخص کو قتل کردے گا اور پھر زندہ کردے گا؛ البتہ وہ مسجد حرام، مسجد مدینہ، مسجد اقصیٰ اور مسجد طور میں داخل نہیں ہوسکے گا، (۲) آخر دمشق میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول ہوگا، امام مہدیؒ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مل کر دجال سے جہاد فرمائیں گے، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام دجال کو قتل کردیں گے۔

احادیث سے یہ بات واضح ہے کہ دجال کسی فتنہ وفساد کا رمزی نام نہیں ہے، جیسا کہ بعض مغرب زدہ تجدد پسند کہتے ہیں؛ بلکہ یہ ایک حقیقی انسان ہے، جو قرب قیامت میں ظاہر ہوگا، اس کے فتنہ کی شدت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ آپ ﷺ فتنہ دجال سے حفاظت کی دُعا کرتے تھے اور لوگوں کو بھی اس کی تلقین فرمایا کرتے تھے :

اللّٰھم إنی أعوذبک من عذاب جھنم ومن عذاب القبر ومن فتنه المحیا والممات ومن فتنه المسیح الدجال۔ (۳)

نزولِ عیسیٰ علیہ السلام

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو یہودیوں نے سولی پر چڑھانے کی کوشش کی تھی؛ لیکن اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ان پر مشتبہ کردیا، وہ انھیں نہ قتل کرسکے اور نہ پھانسی دے سکے؛ بلکہ انھیں آسمان پر اُٹھالیا گیا، قرآن مجید میں اس کا ذکر موجود ہے۔ (نساء: ۱۵۷-۱۵۹)

آگے احادیث سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے حکم سے فتنہ دجال کی سرکوبی کے لئے زمین پر اُتارے جائیں گے، اور دجال کو اپنے ہاتھوں سے قتل

(۱) الفتح الربانی، ترتیب مسند احمد: ۲۴؍۷۳۔　(۲) الفتح الربانی: ۲۴؍۷۶، ترتیب الساعاتی۔

(۳) بخاری، باب التعوذ من عذاب القبر: ۱۳۱۱، مسلم، باب مایستعاذ عنه فی الصلاۃ: ۵۸۸۔

فرمائیں گے، وہی امام مہدی کی نماز جنازہ بھی پڑھائیں گے، اور نازل ہونے کے بعد امام مہدی کی اقتداء میں نماز ادا کریں گے؛ کیوں کہ یہ زمانہ شریعت محمدی کا ہے؛ اس لئے جب تک رہیں گے، شریعت محمدی کی پیروی کریں گے، بالآخر ان کا انتقال ہوگا اور مسلمان ان پر نماز جنازہ پڑھیں گے۔

احادیث میں یہ بات صاف طور پر کہی گئی ہے کہ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مثیل نہیں ہوں گے، اور نہ کوئی اور شخص ہوں گے جو مسیح کی صفات کا حامل ہو؛ بلکہ وہی حضرت عیسیٰ بن مریم علیہما السلام ہوں گے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے نبوت سے نوازے گئے تھے؛ اسی لئے احادیث میں نزول عیسیٰ کی پیشین گوئی کرتے ہوئے 'ابن مریم' کی صراحت کی گئی ہے، جیسے: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے: ''کیف أنتم إذا أنزل ابن مریم فیکم وإمامکم منکم؟''(۱) حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام کے قرب قیامت میں نازل ہونے سے متعلق حدیثیں تواتر کے درجہ کو پہنچی ہوئی ہیں؛ چنانچہ مفسر ابن جریر طبریؒ فرماتے ہیں:

> وأولی هذه الأقوال بالصحة عندنا قول من قال: معنی ذلک: إنی قابضک من الأرض ورافعک إلیّ، لتواتر الأخبار عن رسول الله صلی الله علیه وسلم أنه قال: ینزل عیسی بن مریم فیقتل الدجال۔ (۲)

علامہ ابن کثیرؒ رقم طراز ہیں:

> تواترت الأحادیث عن رسول الله صلی الله علیه وسلم أنه أخبر بنزول عیسی علیه السلام قبل یوم القیامة إماماً عادلاً وحکماً مقسطاً۔ (۳)

علامہ سید انور شاہ کشمیریؒ نے اپنی کتاب ''التصریح بما تواتر فی نزول المسیح''میں ستر حدیثیں نزول مسیح کے سلسلہ میں نقل کی ہیں؛ اس لئے یہ تواتر سے ثابت ہے،

(۱) صحیح البخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب نزول عیسیٰ بن مریم علیہما السلام۔

(۲) تفسیر طبری: ۲۹۱/۳۔ (۳) تفسیر ابن کثیر: ۲۲۳/۷۔

اور اس کا انکار کفر ہے، مشہور محدث شیخ احمد محمد شاکرؒ نزول عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

نزول عيسى عليه السلام فى آخر الزمان ما لم يختلف فيه المسلمون ، لورود الأخبار الصحاح عن النبى صلى الله عليه وسلم بذلك ، وهذا معلوم من الدين بالضرورة ، لا يؤمن من أنكره ۔ (۱)

اس لئے مرزا غلام احمد قادیانی یا بعض اور افتراء پردازوں ، جیسے : موجودہ دور میں ہندوستان میں شکیل بن حنیف کی طرف سے یہ دعویٰ کہ وہ مسیح موعود ہے، باطل اور کفر ہے، اس کا دعویٰ کرنے والا بھی اسلام سے خارج ہے، اور اس کے دعویٰ کو تسلیم کرنے والا بھی۔

قیامت

یوں تو ہر جاندار اپنی مقررہ عمر کے بعد دنیا سے چلا جاتا ہے؛ لیکن ایک ایسا وقت آئے گا، جب پوری دنیا فنا کردی جائے گی ، اور وہ ہوگا قیامت کا دن ، اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضرت اسرافیل علیہ السلام صور پھونکیں گے، حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جمعہ کا دن ہوگا :

إن من أفضل أيامكم يوم الجمعة فيه خلق آدم عليه السلام وفيه قبض وفيه النفخة وفيه الصعقة ۔ (۲)

یہ آواز اتنی ہیبت ناک ہوگی کہ تمام جاندار مر جائیں گے، ہر چیز ریزہ ریزہ ہوکر رہ جائے گی ، یہاں تک کہ زمین و آسمان بھی پھٹ جائیں گے، چاند، ستارے، سب ٹوٹ پھوٹ کر بکھر جائیں گے، حدیث میں اس کی تفصیل آئی ہے؛ لیکن قرآن مجید میں بھی نفخ صور کا ذکر آیا ہے :

وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ۔ (زمر:۶۸)

---

(۱) حاشیہ تفسیر طبری: ۶/ ۴۶۰۔

(۲) نسائی، عن اُوس بن اُوس، حدیث نمبر: ۱۳۷۴، ابوداؤد، عن اُوس بن اُوس، حدیث نمبر: ۱۰۴۷۔

بعثت ثانیہ

پھر چالیس سال یا چالیس ماہ یا چالیس دن کے بعد حکم الٰہی سے دوبارہ صور پھونکیں گے، اور اب تمام لوگ زندہ ہو جائیں گے۔(۱)

اس دوسرے صور کا ذکر بھی قرآن مجید میں موجود ہے :

ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ اُخْرٰى فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ ۔ (الزمر:۶۸)

پہلے صور کو 'نفخہ اولیٰ' یا 'نفخۃ الموت' اور دوسرے صور کو 'نفخہ ثانیہ' یا 'نفخۃ البعث' کہا جاتا ہے۔

اب میدان حشر قائم ہوگا اور تمام لوگ جمع ہو جائیں گے، خود قرآن مجید میں حشر بر پا ہونے اور لوگوں کے اکٹھا ہونے کا ذکر موجود ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

قُلْ اِنَّ الْاَوَّلِيْنَ وَ الْاٰخِرِيْنَ ، لَمَجْمُوْعُوْنَ اِلٰى مِيْقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ۔ (الواقعہ:۴۹-۵۰)

حدیث میں تفصیل آئی ہے کہ تمام لوگ ننگے بدن اور غیر مختون جمع کئے جائیں گے، اور سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ اعزاز حاصل ہوگا کہ انھیں کپڑا پہنایا جائے گا :

إنكم لمحشورون حفاة عراة غرلاً ثم قرء كما بدأنا أول خلق نعيده وعداً علينا إنا كنا فاعلين ، وأول من يكسى يوم القيامة إبراهيم ۔ (۲)

میدانِ حشر کا مرحلہ بہت سخت ہوگا، سورج ایک میل کے بقدر نزدیک آجائے گا، اور گرمی کی شدت کی وجہ سے اس کثرت سے پسینہ آئے گا کہ اپنے اعمال کے اعتبار سے کسی کا پسینہ ٹخنوں تک، کسی کا گھٹنوں تک، کسی کا گردن تک اور کسی کا منھ تک پہنچا ہوا ہوگا، (۳) کچھ

(۱) بخاری عن ابی ہریرہ: ۴۸۱۴۔

(۲) بخاری، عن ابن عباس، حدیث نمبر: ۳۱۷۱، مسلم، حدیث نمبر: ۲۸۶۰۔

(۳) مسلم، عن مقداد بن اسود، حدیث نمبر: ۲۸۶۴۔

ایسے خوش قسمت بھی ہوں گے، جن کو اللہ تعالیٰ کے سائے میں جگہ ملے گی، حدیث میں ایسے سات خوش نصیبوں کا ذکر آیا ہے :

سبعة يظلهم الله في ظله : يوم لا ظل إلا ظله ، الإمام العادل ، وشاب نشأ في عبادة الله ورجل قلبه معلق في المساجد ، ورجلان تحابا في الله اجتمعا عليه وتفرقا عليه ، ورجل دعته امرأة ذات منصب وجمال ، فقال : إني أخاف الله ، ورجل تصدق بصدقة فأخفاها حتى لا تعلم شماله ما تنفق يمينه ، ورجل ذكر الله خالياً ففاضت عيناه ۔ (۱)

نامۂ اعمال

انسان جو بھی اچھا یا بُرا عمل کر رہا ہے، فرشتے اس کو لکھتے جا رہے ہیں، یہ فرشتے ''کراماً کاتبین'' کہلاتے ہیں، جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے، یوں تو انسان کے تمام اعمال اللہ تعالیٰ کے علم میں ہیں؛ لیکن اتمام حجت کے لئے ہر بندہ کو اس کا نامۂ اعمال دے دیا جائے گا، جن لوگوں کا عمل بہتر ہوگا، ان کو دائیں ہاتھ میں اعمال نامہ دیا جائے گا، اور جن کے اعمال بُرے ہوں گے، ان کو بائیں ہاتھ میں، (الحاقہ:۱۹-۲۹) یا بُرے اعمال کرنے والوں کو پشت کی طرف سے نامۂ اعمال سونپا جائے گا۔ (انشقاق:۷-۱۲)

انسان کو حکم دیا جائے گا کہ اپنے اپنے اعمال کو پڑھے: ''اِقْرَاْ كِتٰبَكَ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا'' (بنی اسرائیل:۱۴) نامۂ اعمال میں تو زندگی کا پورا ریکارڈ ہوگا ہی، اس کے علاوہ انبیاء کی شہادتیں بھی پیش ہوں گی، (زمر:۶۹) یہاں تک کہ خود انسان کے اعضاء بول پڑیں گے اور اس کے خلاف گواہی دیں گے۔ (نور:۲۴)

وزنِ اعمال

ان مرحلوں سے گذرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے انصاف کی ترازو قائم کی

(۱)　بخاری، حدیث نمبر:۶۲۲۹، باب من جلس فی المسجد ینتظر الصلاۃ وفضل المساجد۔

جائے گی، جن کی نیکیاں زیادہ ہوں گی، ان کا وزن زیادہ ہوگا، جن کی نیکیاں کم ہوں گی، ان کا وزن کم ہوگا، اوران کا انجام دوزخ ہوگا :

وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذِ ِالْحَقُّ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ، وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَأُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَظْلِمُوْنَ ۔ (الاعراف:۷-۹)

قرآن مجید کی متعدد آیتوں میں وزن اعمال کا ذکر آیا ہے اور حدیثیں تو بکثرت منقول ہیں؛ اسی لئے اہل سنت والجماعت کے نزدیک وزن اعمال حق ہے اور اس کا عقیدہ رکھنا ضروری ہے۔

وزن اعمال کی کیا کیفیت ہوگی اور کس قسم کی ترازو میں اعمال کا وزن ہوگا؟ قرآن وحدیث میں اس کی تفصیل ذکر نہیں فرمائی گئی ہے، اللہ تعالیٰ کی مشیت کے مطابق وزن اعمال کی کیفیت ہوگی، اور تولنے کے لئے میزان ہوگی، اس پر یقین رکھنا چاہئے۔

نامۂ اعمال کے سلسلہ میں بعض فرقِ باطلہ اور تجدد پسند اعتراض کرتے ہیں کہ انسان کی پوری زندگی کا ریکارڈ کیسے اتنے مختصر دفتر میں آجائے گا، جسے لوگوں کے دائیں بائیں ہاتھوں میں دیا جائے گا؟ مگر اللہ تعالیٰ کی قدرت کے مقابلہ یہ اشکال بے معنی ہے، غور کیجئے انسان کے دماغ میں ایک مختصر حصہ ہے، جو میموری کا کام کرتا ہے اور زندگی بھر کی یادیں، شخصیتوں کے چہرے، مختلف جگہوں کی شکلیں اور کتابوں کے ہزاروں صفحات اور نہ جانے کتنی یادداشتیں اسی مختصر سی میموری میں محفوظ ہوجاتی ہیں، پھر اللہ کی دی ہوئی عقل سے فائدہ اُٹھا کر انسان نے ایسی کمپیوٹر چپ بنائی ہے، جس میں ہزاروں تصویریں اور بے شمار کتابوں کے لاکھوں صفحات محفوظ کئے جاسکتے ہیں، تو انسان کی میموری بنانے والے اور اس کو کمپیوٹر چِپ کی صورت سمجھانے والا خدا کیا ایسا نامۂ اعمال تیار نہیں کرسکتا جو بہت مختصر ہونے کے باوجود پوری زندگی کا ریکارڈ محفوظ کرلے؟ یقیناً کرسکتا ہے۔

یہی معاملہ وزن اعمال کا ہے، بعض فرق باطلہ کا خیال تھا کہ ایسی چیز تولی جاتی ہے جو جسامت اور حجم والی ہو، جس میں لمبائی، چوڑائی اور گہرائی ہو، اعمال تو اَعراض ہیں، ان میں

کوئی جسامت نہیں پائی جاتی، پھر انھیں تولا کس طرح جائے گا؟ تو اولاً تو کسی چیز کا ممکن اور ناممکن ہونا مخلوق کے اعتبار سے ہے، خالق کے لئے کوئی چیز ناممکن نہیں ہے، دوسرے: ہر چیز کو تولنے کی ترازو اور ناپنے کا پیمانہ اس کے لحاظ سے ہوتا ہے، موجودہ دور میں سردی و گرمی، بخار، بلڈ پریشر، جسم میں شوگر کی مقدار اور فضا میں ہوا کی رفتار کو تولا جا رہا ہے، تو اللہ تعالیٰ کے لئے کیا دشوار ہے کہ اعمال کی کیفیت کے لحاظ سے ترازو کی تخلیق فرمائیں؟

پُل صراط

حدیث سے یہ بات ثابت ہے کہ قیامت کے دن دوزخ کے اوپر پل صراط بچھایا جائے گا، تمام لوگوں کو اس پل سے گزرنا ہوگا، اہل ایمان تو اس پل سے تیز یا آہستہ آہستہ گذر جائیں گے اور جو ایمان سے محروم ہوں گے، وہ اس پل سے پار نہیں ہو سکیں گے اور دوزخ میں گر جائیں گے۔(۱)

لہٰذا پُل صراط کا قائم ہونا حق ہے۔

حوض کوثر

رسول اللہ ﷺ کو جو خصوصی نعمتیں عطا فرمائی گئی ہیں، ان میں ایک ''حوض کوثر'' ہے، جو آپ کو میدان محشر میں عطا ہوگا؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''اِنَّآ اَعۡطَیۡنٰکَ الۡکَوۡثَرَ'' (کوثر:۱) جو ایک دفعہ اس حوض سے پانی پی لے گا، اسے پھر کبھی پیاس نہیں لگے گی۔(۲)

جنت

اسلام کے بنیادی تصورات میں سے یہ ہے کہ دنیا دار العمل ہے اور آخرت دار الجزاء، نیکیوں کی جزاء جنت ہے، جنت کے سلسلہ میں اسلامی عقائد حسبِ ذیل ہیں :

(۱) جنت کا ہونا حق ہے: ''الجنة حق''۔(۳)

---

(۱) الحدید: ۱۲-۱۴، نیز دیکھئے: ترمذی، حدیث نمبر: ۲۵۵۷۔

(۲) بخاری عن سہل ابن سعد، حدیث نمبر: ۶۵۸۳۔

(۳) شرح عقائد: ۱۰۵۔

قرآن مجید کی بہت سی آیتوں میں جنت کا، اس کی وسعت وکشادگی کا اور اس کی بے حد وحساب نعمتوں کا ذکر فرمایا گیا ہے، جیسے ارشاد ہے :

وَ سَارِعُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَ جَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِیْنَ ۔ (آل عمران:۱۳۳)

(۲) جنت وجود میں آچکی ہے: اسی جنت میں زمین پر اُتارے جانے سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام اور حوا علیہا السلام کو رکھا گیا تھا، وہ اس وقت بھی موجود ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِیْنَ ۔ (آل عمران:۱۳۳)

(۳) جنت ہمیشہ رہے گی اور جو لوگ جنت میں داخل کئے جائیں گے، وہ ہمیشہ جنت ہی میں رہیں گے :

وَ اَمَّا الَّذِیْنَ سُعِدُوْا فَفِی الْجَنَّةِ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ عَطَآءً غَیْرَ مَجْذُوْذٍ ۔ (۱)

چنانچہ امام طحاویؒ فرماتے ہیں :

فأما أبدية الجنة وأنها لا تفنى ولا تبيد فهذا مما يعلم بالضرورة أن الرسول أخبر به ۔ (۲)

(۴) جنت میں صرف اہل ایمان ہی داخل کئے جائیں گے: البتہ بعض لوگ اپنے اعمال کی وجہ سے شروع سے جنت میں داخل کر دیئے جائیں گے، اور بعض لوگ گناہوں کی سزا پانے کے بعد؛ لیکن وہ ضرور جنت میں داخل کئے جائیں گے؛ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا :

ما من عبد قال لا إله إلا الله ثم مات على ذلک إلا دخل الجنة ۔ (۳)

---

(۱) ہود:۱۰۸۔ (۲) عقیدۃ الطحاوی مع الشرح:۴۲۵۔

(۳) مسلم، عن ابی ذر، کتاب الایمان، حدیث نمبر:۹۴۔

(۵) جنت کی نعمتوں میں سے سب سے بڑی نعمت یہ ہے کہ تمام اہل جنت کو اللہ تعالیٰ کا دیدار حاصل ہوگا؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

وُجُوْهٌ يَّوْمَىِٕذٍ نَّاضِرَةٌ ، اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ۔ (القیامۃ:۲۲-۲۳)

حدیث میں بھی دیدار الٰہی کا تفصیل سے ذکر آیا ہے کہ جب اہل جنت جنت میں داخل ہوجائیں گے تو اللہ تعالیٰ دریافت فرمائیں گے : کیا تم کوئی اور نعمت بھی چاہتے ہو؟ اہل جنت کہیں گے : آپ نے ہمارے چہروں کو روشن کردیا، ہمیں جنت میں داخل فرمایا، اور دوزخ سے نجات عطا کی، پھر اس کے بعد اور کیا نعمت ہوسکتی ہے؟ اب اللہ تعالیٰ اپنا دیدار کرائیں گے، پھر اہل جنت کہہ اُٹھیں گے کہ دیدار الٰہی سے بڑھ کر ہمیں کوئی نعمت نہیں دی گئی ؛(۱) البتہ یہ دیدار اللہ کی شان کے مطابق ہوگا، نہ جہت ہوگی اور نہ مکان ہوگا، یہ اہل سنت والجماعت کا متفق علیہ عقیدہ ہے :

ذهب أهل السنة إلى أن الله تعالى يجوز أن يرى وأن المومنين فى الجنة يرونه منزها عن المقابلة والجهة والمكان ۔ (۲)

جہنم (دوزخ)

جیسے نیک کاروں کے بدلہ کے طور پر جنت ہے، اسی طرح بدکاروں کے لئے جہنم ہے، اس سلسلہ میں اہل سنت والجماعت کے عقائد حسبِ ذیل ہیں :

(۱) دوزخ کا ہونا حق ہے، اور اس پر ایمان لانا واجب ہے :

والجنة حق والنار حق ؛ لأن الآيات والأحاديث فى شأنهما أشهر من أن يخفى وأكثر من أن يحصى ۔ (۳)

قرآن مجید کی کتنی ہی آیتوں میں دوزخ کا ذکر موجود ہے؛ چنانچہ ارشاد ہے :

---

(۱) مسلم، عن صہیب، حدیث نمبر:۱۷۱۔　(۲) شرح المقاصد: ۳/ ۱۲۴۔

(۳) نبراس:۲۱۹۔

فَاَمَّا الَّذِيْنَ شَقُوْا فَفِي النَّارِ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّشَهِيْقٌ ۔ (۱)

(۲) جنت کی طرح دوزخ بھی پیدا ہو چکی ہے اور اس وقت موجود ہے :

والجنة والنار مخلوقتان اليوم أى موجودتان الآن قبل يوم القيامة ۔ (۲)

چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

وَ اتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْٓ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ۔ (آل عمران:۱۳۱)

(۳) دوزخ بھی ہمیشہ ہمیشہ رہے گی، اور جو لوگ کفر کی وجہ سے دوزخ میں داخل کئے جائیں گے، وہ بھی ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

قِيْلَ ادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ۔ (الزمر:۷۲)

یہی مسلمانوں کا عقیدہ ہے :

أجمع المسلمون على خلود أهل الجنة فى الجنة وخلود الكفار فى النار ۔ (۳)

(۴) بعض مسلمان بھی گناہوں کے ارتکاب کی وجہ سے دوزخ میں داخل کئے جائیں گے؛ لیکن ان کا دوزخ میں رہنا عارضی ہوگا، وہ بالآخر دوزخ سے نکالے جائیں گے اور جنت میں داخل کئے جائیں گے، حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ رسول اللہ ﷺ سے فرمائیں گے :

أخرجوا من النار من قال : لا إله إلا الله وكان فى قلبه من الخير ما يزن شعيرة ، أخرجوا من النار من قال : لا إله إلا الله وكان فى قلبه من الخير ما يزن برة ، أخرجوا من النار من قال لا إله إلا الله وكان فى قلبه من الخير ما يزن ذرة ۔ (۴)

---

(۱) ہود:۱۰۶۔ (۲) شرح فقہ اکبر:۹۸۔ (۳) شرح المقاصد:۳/۳۸۰۔

(۴) جامع الترمذی، ابواب صفۃ جہنم، حدیث نمبر:۵۹۳۔

اَعراف

عُرفؒ کے معنی بلند جگہ کے ہیں، جنت اور دوزخ کے درمیان ایک بلند دیوار ہوگی، جس کا نام اعراف ہوگا، جس کے گناہ اتنے زیادہ نہ ہوں کہ دوزخ کے مستحق ہوجائیں، اور نیکیاں بھی اتنی زیادہ نہ ہوں کہ وہ جنت کے حقدار قرار پائیں، ان کو ابتداءً اعراف میں جگہ دی جائے گی، وہ اہل جنت کو بھی دیکھ سکیں گے اور اہل دوزخ کو بھی، اہل جنت کو دیکھ کر تمنا کریں گے کہ اللہ تعالیٰ انھیں جنت میں داخل کردے اور دوزخ کی ہولناکیوں کو دیکھ کر اس سے پناہ چاہیں گے، انجام کار اللہ تعالیٰ ان کو جنت میں داخل فرمادیں گے، قرآن مجید میں اس کا ذکر موجود ہے۔ (اعراف: ۳۹-۴۵)

تمرینی سوالات

(۱) عقیدۂ آخرت کی کیا دلیل ہے؟

(۲) نظریۂ تناسخ سے کیا مراد ہے؟

(۳) قبر میں سوال وجواب سے متعلق اہل سنت والجماعت کا کیا نظریہ ہے اور اس کی کیا دلیل ہے؟

(۴) قیامت کی علاماتِ کبریٰ کیا کیا ہیں؟

(۵) امام مہدی کی کیا علامتیں ہیں اور کیا مہدی اور مسیح ایک ہی شخصیت ہیں؟

(۶) دجال کی کیا علامتیں حدیث میں آئی ہیں؟

(۷) نزولِ عیسیٰ کا عقیدہ کس دلیل سے ثابت ہے؟

(۸) نامۂ اعمال کے سلسلے میں اہل سنت والجماعت کے عقائد پر روشنی ڈالئے اور اس کی دلیل پیش کیجئے؟

(۹) پُل صراط اور حوضِ کوثر کی تشریح کیجئے؟

(۱۰) جنت کے بارے میں اہل سنت والجماعت کے کیا کیا عقائد ہیں؟

(۱۱) دوزخ کے بارے میں اہل سنت کے کیا عقائد ہیں؟

(۱۲) اعراف سے کیا مراد ہے اور اس میں کون لوگ رکھے جائیں گے؟

تقدیر پر ایمان

جن چیزوں پر ایمان لانا ضروری ہے، ان میں ایک تقدیر ہے؛ چنانچہ تقدیر پر ایمان کے سلسلہ میں اہل علم نے لکھا ہے :

والقدر أی وبالقضاء والقدر خیرہ وشرہ ، أی نفعه وضرہ وحلوہ ومرہ حال کونه من اللہ تعالیٰ ، فلا تغیر للتقدیر فیجب الرضا بالقضاء والقدر ، وھو تعیین کل مخلوق بمرتبته التی توجد من حسن وقبح ونفع وضر ، وما یحیط به من مکان وزمان ، وما یترتب علیه من ثواب أو عقاب ۔ (۱)

تقدیر کے معنی اندازہ کرنے اور متعین کرنے کے ہیں ، تقدیر سے مراد یہ ہے کہ کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے اور ہوتا رہے گا ، وہ سب اللہ کے علم میں ہے، اور اللہ تعالیٰ نے اسے پہلے سے لکھ دیا ہے :

اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ مَا فِی السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ اِنَّ ذٰلِكَ فِیْ كِتٰبٍ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَی اللّٰهِ یَسِیْرٌ ۔ (الحج:۷۰)

تقدیر سے قریب ایک اور لفظ قضاء ہے، بعض اہل علم کے نزدیک قدر اور قضاء ایک ہی چیز ہے، اور بعض اہل علم نے دونوں میں اس طرح فرق کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں ازل سے جس چیز کی جو شکل ہے وہ قدر یا تقدیر ہے، اور پھر اللہ تعالیٰ نے اسی کو جاری فرمایا، وہ قضاء ہے۔

تقدیر کی وجہ سے انسان کسی عمل پر مجبور نہیں ہو جاتا ، اس کو سمجھنے کے لئے تین نکات کو سامنے رکھنا چاہئے :

---

(۱) شرح فقہ اکبر: ۱۳۔

(۱) علم الٰہی : یعنی اللہ تعالیٰ کو یہ بات معلوم ہے کہ کیا چیز کیسی ہوگی؟ جیسے ایک استاذ اپنے شاگرد کے بارے میں اندازہ کرتا ہے کہ یہ کامیاب نہیں ہوگا، ڈاکٹر مریض کے بارے میں اندازہ کرتا ہے کہ یہ صحتیاب نہیں ہوسکے گا، فرق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم کامل ہے؛ اس لئے اس کے خلاف پیش نہیں آسکتا، اور انسان کا علم ناقص ہے؛ اس لئے اس کے اندازے غلط ثابت ہوسکتے ہیں، پس، جیسے: اس ناکام ہونے والے طالب علم کے ناکام ہونے کا اور اس مرجانے والے مریض کے مرجانے کا ذمہ دار ڈاکٹر کو قرار نہیں دیا جاسکتا؛ اسی طرح انسان کے گناہ کے بارے میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ خدا نے اس کو گناہ پر مجبور کردیا ہے۔

(۲) ارادہ وکسب : اللہ تعالیٰ نے انسان کو ارادہ کرنے کی آزادی عطا فرمائی ہے، انسان نیکی کا بھی ارادہ کرسکتا ہے اور بدی کا بھی، انسان کو ثواب وعذاب دراصل اسی قوت ارادہ کے صحیح وغلط کے استعمال کی وجہ سے دیا جاتا ہے، اس کو قرآن مجید میں ''کسب'' کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے: ''لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ عَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ''۔ (بقرہ:۲۸۶)

(۳) اللہ تعالیٰ کی مشیت : اگرچہ انسان کو ارادہ کی قوت عطا فرمائی گئی ہے؛ لیکن صرف انسان کے ارادہ سے کوئی چیز وجود میں نہیں آتی، جب تک کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت اس کے ساتھ نہ ہو؛ چوں کہ یہ دنیا دار الامتحان ہے؛ اس لئے جب انسان اچھی بات کا ارادہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی مشیت اس میں مدد ومعاون ہوجاتی ہے، اور جب انسان گناہ پر کمر کس لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی مشیت اس میں بھی مددگار ہوجاتی ہے، جیسا کہ ارشاد ہے :

فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَ اتَّقٰى ، وَ صَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ، فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى ، وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى ، وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى ، فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى ۔ (اللیل:۵-۱۰)

پس یہ سمجھنا درست نہیں ہے کہ انسان مجبور محض ہے، وہ تکوینی چیزوں میں تو مجبور ہے، جیسے شکل وصورت، رنگ وروپ وغیرہ؛ لیکن اپنے عمل میں مجبور نہیں ہے، اس کو ارادہ واختیار کی آزادی دی گئی ہے اور اسی کی وجہ سے اس سے ثواب وعقاب متعلق ہوگا۔

اللہ تعالیٰ نے بندوں کے احوال کے اعتبار سے جو کچھ لوح محفوظ میں تحریر فرمایا ہے، وہ دو قسم کے ہیں :

(۱) تقدیر مبرم : جو بات قطعی طور پر لکھ دی گئی ہے اور وہ اَٹل ہے۔

(۲) تقدیر معلق : جس میں مشروط طور پر بات لکھی گئی ہے، مثلاً: اگر اس نے والدین کی خدمت نہیں کی تو اس کی عمر ۱۵ سال ہوگی اور اگر والدین کی خدمت کی تو اس کی عمر ۵۰ سال ہوگی؛ البتہ اللہ تعالیٰ کے علم میں یہ بات موجود ہے کہ بالآخر اس میں سے کونسی بات پیش آئے گی :

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم : كتب الله مقادير الخلائق ... قدروا عين مقاديرهم تعيينا بتا لا يتأتى خلافه بالنسبة لما فى علمه القديم المعبر عنه بأم الكتاب ، أو معلقاً كأن يكتب فى اللوح المحفوظ فلان يعيش عشرين سنة إن حج وخمسة عشر إن لم يحج ، وهذا هو الذى يقبل المحو والإثبات المذكورين فى قوله إلا ما يوافق ما أبرم فيها ، كذا ذكره ابن حجر ۔(۱)

تقدیر کا مسئلہ بڑا نازک ہے اور عام لوگوں کے لئے اس کا سمجھنا دشوار ہوتا ہے؛ اس لئے رسول اللہ ﷺ نے مسئلہ تقدیر پر گفتگو کرنے کو نا پسند کیا ہے :

خرج علينا رسول الله صلى الله عليه وسلم ونحن نتازع فى القدر فغضب حتى احمر وجهه الخ ۔ (۲)

اُم المومنین حضرت عائشہؓ نے رسول اللہ ﷺ کا قول نقل کیا ہے :

من تكلم فى شئى من القدر سئل عنه يوم القيامة ومن لم يتكلم فيه لم يسئل عنه ۔(۳)

(۱) مرقاۃ المفاتیح: ۱/ ۱۴۵۔ (۲) ترمذی عن ابی ہریرہ، حدیث نمبر: ۲۱۳۳۔

(۳) سنن ابن ماجہ، باب فی القدر، حدیث نمبر: ۸۴۔

مسئلہ تقدیر پر بحث کے سلسلہ میں امام طحاویؒ نے ان الفاظ میں متنبہ کیا ہے :

وأصل القدر سر الله تعالیٰ ... والتعمق والنظر فی ذلک ذریعة الخذلان ۔ (۱)

دنیا میں عقیدۂ تقدیر کا فائدہ

تقدیر کا عقیدہ انسان کے لئے قلب کے سکون اور طمانینت کا بھی باعث ہے، انسان کو جب کوئی رنج پہنچتا ہے تو اس وقت یہ بات کہ اللہ کی طرف سے یہی مقدر تھا، انسان کے لئے صبر کرنے کو آسان کر دیتا ہے اور خیال ہوتا ہے کہ جب یہ اللہ کا فیصلہ ہے تو اسی میں خیر ہوگا، انسان کی فطرت میں حرص وطمع رکھی گئی ہے، عام طور پر اس حرص کی کوئی سرحد نہیں ہوتی، انسان کا نفس هل من مزید؟ کی آواز لگا تا رہتا ہے، ایسی صورت میں جب انسان کی خواہش پوری نہ ہو تو یہ بات اس کے لئے سخت تناؤ اور اضطراب کا سبب بنتی ہے، جس انسان کا تقدیر پر یقین ہوتا ہے، وہ اس مرحلہ میں یہ سوچ کر مطمئن ہو جاتا ہے اور نفسیاتی کرب سے بچ جاتا ہے کہ اس کے لئے اتنا ہی مقدر تھا۔

اس لئے تقدیر کا عقیدہ ایک طرف انسان کے توحید پر یقین کو بڑھاتا ہے اور خدا سے دُعاء اور طلب پر آمادہ کرتا ہے؛ کیوں کہ وہ سمجھتا ہے کہ جو کچھ ہوگا، اللہ ہی کے فیصلہ سے ہوگا، دوسری طرف یہ اس کو نفسیاتی اعتبار سے سکون وراحت فراہم کرتا ہے۔

تمرینی سوالات

(۱) تقدیر سے کیا مراد ہے؟

(۲) تقدیر معلق اور تقدیر مبرم کی تشریح کیجئے؟

(۳) مسئلۂ تقدیر پر گفتگو کرنے کے بارے میں سلفِ صالحین کا کیا نظریہ ہے؟



(۱) شرح العقیدۃ الطحاویۃ لصدر الدین الدمشقی: ۱/ ۲۲۵۔

اس کتاب کے بارے میں!

کسی علمی کتاب میں تین باتیں بہ طورِ خاص دیکھنے کی ہوتی ہیں، ایک: اس کا مواد اور ماٰخذ، دوسرے: اس مواد سے نتائج کا استخراج اور موضوع کا تحلیل وتجزیہ، تیسرے: ترتیب اور اُسلوبِ بیان، جہاں تک مواد اور ماٰخذ کا تعلق ہے تو فاضل مؤلف کی یہ کاوش قابل تعریف وتحسین ہے کہ انھوں نے کافی محنت کے ساتھ موضوع کا اُس کے مستند ماٰخذ سے مطالعہ کیا ہے، اور اس کتاب میں کار آمد مواد جمع کر دیا ہے، رہا اس مواد سے نتائج کا استخراج، موضوع کا تحلیل وتجزیہ اور ترتیب واُسلوبِ بیان، سو اِس لحاظ سے بھی یہ ایک کامیاب اور قابلِ ستائش کوشش ہے، اس سے پہلے بھی فاضل مؤلف دینی مدارس کے لئے نصابی نقطۂ نظر سے متعدد کتابیں مرتب فرما کر نتیجہ خیز مساعیٔ جمیلہ فرما چکے ہیں، بلا مبالغہ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ: سہل نویسی وشیریں زبان میں موجودہ علماء کے درمیان موصوف ممتاز مقام کے حامل ہیں، وہ لاجواب زبان لکھتے اور بولتے ہیں، شیرینی، پختگی اور قرآن وحدیث کے ذخیرے سے تُرشی ہوئی ان کی زبان اپنی الگ شناخت رکھتی ہے، وہ جب بولتے ہیں تو موتیاں رولتے ہیں اور جب لکھتے ہیں تو قلم سے فصاحت وبلاغت اُبلتی ہے، اور جو کچھ لکھتے ہیں اُس کی سطر سطر سے نورانیت اور روحانیت چھلکتی ہے، اُن کو پڑھنے اور سننے والا کبھی اُکتاتا ہے اور نہ سیر ہوتا ہے؛ بلکہ شوق وذوق سے سنتا اور پڑھتا چلا جاتا ہے۔

حضرت مولانا مفتی احمد خانپوری صاحب دامت برکاتہم

(شیخ الحدیث: جامعہ تعلیم الدین ڈابھیل، گجرات)